ماہنامہ

انذار

Inzaar

مدیر: ابو یحییٰ

جنوری ۲۰۲۱

www.inzaar.pk

January 2021

نیا سال اس بات کا اعلان عام ہے کہ
خود کو بہتر بنانے کا موقع ابھی باقی ہے
نیا سال ایک وارننگ بھی ہے کہ
خود کو بہتر بنانے کا وقت ختم ہو رہا ہے

Please visit our websites to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

www.inzaar.pk (Urdu Website)

Join us on twitter @AbuYahya_inzaar

Join us on Facebook

Abu Yahya's Official Page: facebook.com/abuyahya.inzaar

Inzaar Official Page: facebook.com/inzaartheorg

Join us on YouTube youtube.com/inzaar-global

WhatsApp Broadcast list: Please contact +92-334-1211120 from WhatsApp (Daily Msg Service-Broadcast Lists – No Groups)

To get books and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Pakistan, contact 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit ww.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to **info@inzaar.org** and info@inzaar.pk

Our material in audio form is available on USB/CD

ماہنامہ
اِنذار
جنوری 2021ء جمادی الاول/جمادی الثانی 1442ھ
جلد 9 شمارہ 1

ابو یحییٰ کے قلم سے

فی شمارہ ___ 40 روپے
سالانہ (بذریعہ رجسٹری) صرف 900 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر (VP) یا اکاؤنٹ)

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201 , 0312-2099389
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.pk

دو اوصاف

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے بہت سی صفات بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک صفت ''الرحمٰن'' کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذاتی نام کے طور پر استعمال کیا ہے۔ الرحمٰن کا مطلب وہ ہستی ہے جس کی ذات پر رحمت کا وصف اس طرح غالب ہو کہ وہ اس کی پوری شخصیت پر چھا جائے۔ چنانچہ اسم الرحمٰن یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر صفت پر ان کی رحمت غالب ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اسی رحمت کا ظہور ہے کہ اس نے مخلوق کو وجود بخشا گرچہ اسے اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اسی کی رحمت ہے جس نے انسان کو پیدا کر کے اسے یہ موقع دیا کہ وہ جنت کی شکل میں خدا کے اس انعام کو پالے جسے اس نے کسی اور مخلوق کو نہیں دیا۔ وہ انسان جو زندگی، لذت، طاقت، حسن، اور اقتدار کا حریص ہے۔

اس دنیا میں انسان انھی چیزوں کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ موت کی دہلیز تک آ پہنچتا ہے۔ اس وقت اسے معلوم ہوتا ہے، اس دنیا میں یہ تمام چیزیں تعارف کے پہلو سے رکھی گئی تھیں۔ ان چیزوں کو پانے کی اصل جگہ تو جنت کی بادشاہی تھی۔ جس کے بعد پچھتاووں اور مایوسی کے سوا انسان کے حصے میں کچھ نہیں آتا۔

مگر خدا کا یہ احسان عظیم ہے کہ اس نے اپنی کتاب قرآن مجید میں جنت کی مقررہ قیمت کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اس قرآنی تعلیم کا خلاصہ کیا جائے تو یہ دو بنیادی چیزوں کا نام ہے۔ ایک یہ کہ انسان غیب میں رہ کر بھی خدائے رحمٰن کی عظمت کے سامنے سربسجود ہونا سیکھ لے۔ دوسرے یہ کہ وہ مخلوق خدا کے لیے نفع بخش بن کر جیے۔

جو لوگ موت کے وقت ان اوصاف سے جتنا قریب ہوئے وہ جنت میں اتنا ہی اونچا مقام پائیں گے اور جو لوگ جتنا دور ہوئے وہ جہنم کی اتنی ہی پست کھائی میں گریں گے۔

ہماری دنیا

پچھلے دنوں ہماری پچھلی سڑک پر ایک گھر آباد ہوا۔ رواج کے مطابق گھر کے نئے مالکوں نے نہ صرف اپنا گھر نئے سرے سے آراستہ کیا بلکہ اس کے ساتھ انھوں نے ایک ایسا کام بھی کیا جو ہمارے معاشرے میں بالکل اجنبی ہے۔

ان کا گھر کونے کا تھا جہاں ان کی سڑک کو ایک دوسری سڑک عبور کر رہی تھی۔ دو سڑکوں کے اس سنگم پر ان کا کارنر کا گھر تھا جس کے تین سمت تین گھر اور تھے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے گھر کے باہر قطعہ اراضی پر گھاس لگائی بلکہ تینوں گھروں کے باہر کے حصے کو صاف ستھرا کر کے نئی گھاس بھی لگوائی۔ اپنے گھر کے باہر نئے درخت لگانے کے ساتھ سڑک کو آنے جانے کے دو حصوں میں تقسیم کرنے والے آئی لینڈ پر بھی ناریل کے درخت لگوائے۔ ساتھ ہی سڑکوں کے سنگم پر بنے چھوٹے سے راؤنڈ اباؤٹ پر رنگین پتھر لگوا کر اسے ایک خوبصورت شکل دے دی۔ مزید یہ کہ راؤنڈ اباؤٹ پر لگے کھمبوں اور ناریل کے تنوں پر رنگ کروا کے ان کو بھی ایک خوبصورت شکل میں نمایاں کر دیا۔ میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں تو انتہائی خوشگوار احساس ہوتا ہے۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں لوگ اپنا گھر صاف کر کے کچرا گھر سے باہر پھینک دیتے یا کم از کم گھر کے اردگرد کے حسن و قبح سے بے نیاز رہتے ہیں، یہ رویہ نہ صرف قابل تعریف بلکہ قابل تقلید ہے۔ اس طرح کا کام کوئی بھی مڈل کلاس شخص کر سکتا ہے۔ مگر ہمارا مسئلہ پیسے کی نہیں بلکہ شعور کی کمی ہے۔ ہمارے اندر یہ شعور ہی پیدا نہیں کیا گیا کہ اپنی ذات، فیملی اور گھر سے باہر کی دنیا بھی میری دنیا ہے۔ میرا محلّہ بھی میرا گھر ہے اور میرا شہر اور ملک بھی میرا گھر ہے۔ آہ کہ ہمارے اندر یہ احساس نہیں، اس لیے ہم صرف ''اپنی دنیا'' میں جیتے ہیں۔ جس روز ہم اپنی ذات سے بلند ہو کر باہر کی دنیا کو بھی اپنا سمجھنے لگے، ہماری قوم کی صورتحال بہت بہتر ہونے لگے گی۔

قتل عام پر ہماری خاموشی

دو ماہ قبل میرے نوجوان بھانجے عبدالسمیع کا ایک ٹریفک حادثے میں انتقال ہوگیا تھا۔ حادثے کے بعد میں نے پاکستان میں ٹریفک کے حادثات کے موضوع پر کافی تحقیق کی۔ پھر اس مسئلے کے حوالے سے متعدد آرٹیکل لکھے اور ایک ویڈیو لیکچر بھی ریکارڈ کرایا ہے جس میں اس مسئلے کی سنگینی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ بھی بتایا کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے۔

اس دوران میں مجھے یہ اندازہ ہوا کہ بیشتر لوگوں کو اس طرح کی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کے نزدیک انسانی جان کا زیاں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ مجھے متعدد پہلوؤں سے اس معاملے میں اپنی قومی بے حسی کا اندازہ ہوا۔ مثال کے طور اس موضوع پر بنائی گئی میری ویڈیو بعنوان ''قتل عام پر ہماری خاموشی''، ہمارے یوٹیوب چینل کی ناکام ترین ویڈیو ہے جسے دو ماہ میں بمشکل دو ہزار ویوز ہی مل سکے۔ کسی نے اسے شیئر کرنے اور آگے پہنچانے کی کوشش بھی نہیں کی حالانکہ اس میں بہت تفصیل سے ٹریفک کے مسئلے کی سنگینی اور حل کی طرف توجہ دلائی گئی تھی جو سالانہ لاکھ کے لگ بھگ لوگوں کی جان لے لیتا ہے۔

اس کے برعکس اگر ''داڑھی کی شرعی حیثیت''، ''نواز شریف بمقابلہ عمران خان''، ''لونڈیوں سے جنسی تعلق کی شرعی حیثیت''، ''یہود و ہنود کی سازشیں'' وغیرہ جیسے موضوعات پر لکھا اور بولا جائے تو یہ ان گنت لوگوں کی دلچسپی کی چیز بن جاتی ہے۔ یہ تقابل ہماری بے حسی کا کھلا بیان ہے۔

انسانی جان کی حرمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہم ترین چیز ہے۔ جو معاشرے اس حرمت کی پامالی پر اس طرح بے حس ہوجائیں، وہ معاشرے اپنی خاموشی اور بے حسی سے قہر الٰہی کو دعوت دیتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ سردست ایک ایسا ہی معاشرہ بن چکا ہے۔ ہم نے اگر اپنی روش کو نہیں بدلا تو جلد یا بدیر قہر الٰہی کا کوڑا برسے گا اور پھر ہر بے حس کی کھال کھینچ دی جائے گی۔

عشق رسول

پاکستان میں الحمدللہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ عاشقان رسول پائے جاتے ہیں۔اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے ہاں کسی شخص کے عاشق رسول ہونے کے لیے یہی ثبوت بہت کافی ہوتا ہے کہ وہ عشق کا دعویٰ اور باتیں کردے۔

قطع نظر اس حقیقت کے کہ قرآن وحدیث میں اللہ اوراس کے رسول سے ''عشق'' کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا بلکہ اللہ اوراس کے رسول سے ''محبت'' کا تصور پایا جاتا ہے، یہ بات واضح کرنا دین کے طالب علموں کی ذمہ داری ہے کہ اللہ اوراس کے رسول سے محبت کا قرآنی معیار لوگوں کے سامنے رکھتے رہیں۔اس کا سبب یہ ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کے دعووں اور باتوں کو اٹھا کر پھینک دیا جائے گا اور صرف اس شخص کا دعویٰ محبت قبول کیا جائے گا جو قرآن مجید کے معیار پر پورا اترتا ہوگا۔

ہم سے قبل یہود میں بھی یہ مرض موجود تھا کہ وہ ایک طرف اللہ کے احکام کی بدترین خلاف ورزی کرتے تھے اور ساتھ میں اس سے محبت کے دعوے بھی کرتے تھے۔ چنانچہ ان کو بتایا گیا کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت کرتے ہو تو تمھیں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنا ہوگا۔تب ہی اللہ تم سے محبت کرے گا، (آل عمران 31:3)۔ یہ آیت واضح طور پر بیان کرتی ہے کہ محبت کے دعووں کی سچائی کا ایک ہی مستند ثبوت ہے، وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے۔اس کے بغیر محبت کا کوئی دعویٰ معتبر نہیں ہوسکتا۔

جو شخص ایمان واخلاق کی دعوت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہے، وہی درحقیقت اللہ اور اوراس کے رسول سے محبت کے دعووں میں سچا ہے۔یہی لوگ آخرت کی فلاح کے حقدار ہیں۔ جو لوگ اس اتباع کے بغیر دعویٰ محبت کرتے ہیں وہ غیر سنجیدہ لوگ ہیں اور قیامت کے دن سوائے محرومی کے ان کے حصے میں کچھ نہ آئے گا۔

تین نبی

قرآن مجید کی سورہ ص کی آیات 17 تا 44 میں اللہ تعالیٰ نے تین نبیوں کے واقعات سنائے ہیں۔ یہ تینوں نبی بادشاہ اور سردار تھے اور ہر طرح کی طاقت و دولت کے مالک تھے مگر اس کے باوجود ان کا مشترکہ وصف خدا کی طرف رجوع تھا جس کے لیے اواب کی صفت بیان ہوئی ہے۔ یہ انبیا حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت ایوب علیہم السلام ہیں۔

ان انبیا کے واقعات قریش کے ان سرداروں کو سنائے گئے ہیں جو معمولی سی طاقت وقوت کو پا کر مغرور اور سرکش ہو گئے تھے اور خدا کے براہ راست خطاب یعنی قرآن مجید کو سن کر بھی کفر وسرکشی پر قائم تھے۔ ان کو یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کے نیک بندے بادشاہ بن کر بھی کیسے رجوع، انابت اور اوابیت میں جیتے ہیں۔ تاہم اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ان واقعات میں ایک کام اور کیا ہے۔ وہ یہ کہ بنی اسرائیل نے ان تینوں جلیل القدر انبیا پر انتہائی سخت تہمتیں لگائی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی انابت ورجوع کے بیان میں تمام تہمتوں سے ان انبیا کی براءت کا اعلان کیا ہے۔

پہلا واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کا ہے۔ ان پر یہود نے ایک انتہائی سخت تہمت لگا رکھی تھی جو اِس وقت بھی ان کی مقدس کتاب کا حصہ ہے۔ وہ تہمت یہ تھی کہ معاذ اللہ انھوں نے اپنے ایک فوجی افسر کی بیوی کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب کیا جس سے وہ حاملہ ہوئی اور پھر اس فوجی افسر کو سازش کر کے مروا دیا۔ قرآن مجید نے اس واقعے میں ان کی دیگر خوبیوں کے ساتھ اس بہتان کی بھی بھرپور تردید کی ہے۔

سورہ ص کی ان آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی موقع پر ان کے ذہن میں کسی اور شخص کی کسی چیز پر تصرف کا کوئی خیال پیدا ہوا تھا۔ مگر جب ایک قضیے کا فیصلہ کرتے ہوئے انھیں محسوس ہوا کہ ممکنہ طور پر ان کا معاملہ بھی یہی نہ ہو تو انھوں نے فوراً رجوع کر کے توبہ واستغفار کی۔ حالانکہ

وہ ایک انتہائی طاقتور بادشاہ تھے اور اپنی بات منوانے کی بھرپور طاقت بھی رکھتے تھے۔اسی طرح وہ اپنی ذہانت اور قوت بیان کے بل پر اپنے کسی بھی عمل کی کوئی بھی اخلاقی توجیہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔مگر بالواسطہ طریقے پر بھی توجہ دلانے پر وہ ساری طاقت اور صلاحیت کے باوجود سجدے میں گر کر خدا سے بخشش کے طلبگار ہو گئے۔

اس واقعے میں سرداران قریش کو یہ تنبیہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے مقابلے میں یہ کس کھیت کی مولی ہیں اور ساتھ میں یہود کے کسی ایسے الزام کی بھرپور تردید بھی کہ اس درجہ کی طاقت رکھنے کے باوجود ایسا توبہ و رجوع کرنے والا شخص کیسے ایسی ظالمانہ اور بے ہودہ حرکت کر سکتا ہے۔

دوسرا واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہے۔ان پر یہ تہمت لگائی گئی کہ معاذ اللہ انھوں نے اپنی بیویوں کے کہے میں آ کر شرک کا ارتکاب کیا۔قرآن نے اس مقام پر ان کا ایک واقعہ سنا کر یہ بتایا ہے کہ ان کا حال تو یہ تھا کہ ایک فوجی پریڈ کے موقع پر جہاد کی غرض سے تیار کیے گئے اعلیٰ نسل کے گھوڑے دیکھتے ہوئے سورج ڈوب گیا اور ان کی عصر کی نماز رہ گئی۔ جہاد کی تیاری کے دوران میں بھی غلطی سے نماز رہ جانے پر ان کو اتنا قلق تھا کہ انھوں نے اپنے ان انتہائی محبوب گھوڑوں کو ہی ذبح کر دیا جن میں لگ کر ان کی عصر کی نماز قضا ہو گئی تھی۔ جو شخص ایک نماز کے معاملے میں اس درجہ حساس ہو وہ شرک کا ارتکاب کیسے کر سکتا ہے؟

تیسرا واقعہ حضرت ایوب علیہ السلام کا ہے جن پر بہتان یہ تھا کہ انھوں نے آزمائش کے دنوں میں اللہ تعالیٰ سے بہت شکوہ شکایت بھی کیا تھا۔قرآن نے واضح کیا کہ وہ ایک صابر شخص تھے۔مشکل ترین حالات میں جب وہ اموال واولاد سب سے محروم ہو گئے اور پھر بدترین جسمانی عوارض نے انھیں گھیر لیا، وہ صبر کرتے رہے۔انھوں نے سارے امتحانوں میں اگر کسی کو ان

مصائب کا ذمہ دار سمجھا تو وہ شیطان تھا۔ اللہ تعالیٰ سے تو وہ ہمیشہ فریاد کر کے اس کی رحمت کو پکارتے رہے۔ چنانچہ ایک وقت آیا کہ اللہ نے ان کے سارے مصائب کو دور کر کے ان کی صحت انھیں لوٹا دی اور پہلے سے زیادہ مال و اولاد ان کو عطا کیے۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے ایک قسم کھالی تھی کہ صحت مند ہونے کے بعد خود کو سو کوڑے ماریں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ حکم دیا کہ تنکوں کی ایک جھاڑو خود کو مار لو۔ تمھاری قسم پوری ہو جائے گی۔ ایک جھاڑو کی مار کے الفاظ شکوے شکایت کی یہودی داستان طرازی کی پوری پول کھول دیتے ہیں۔ بات صرف اتنی تھی کہ کسی موقع پر کوئی ایسا جملہ ان کی زبان سے نکل گیا ہو گا جو صبر کے منافی تھا۔ مگر ان کی ایمانی غیرت نے اس چھوٹی سی بات کو جو قطعاً غیر فطری نہیں تھی، اتنا بڑا جرم سمجھا کہ اپنے لیے سو کوڑوں کی سزا مقرر کر لی۔ جبکہ بات بس اتنی ہی تھی کہ عدل کے مطابق وہ اس بات کا ازالہ کرنا چاہتے تو ایک جھاڑو کا لگنا بھی کافی تھا۔ چنانچہ اللہ نے ایک جھاڑو مارنے کا حکم دے کر انھیں سزا کم کرنے اور قسم پوری کرنے کا کوئی حیلہ نہیں سکھایا تھا بلکہ ان کی بات کی نوعیت کے مطابق ان کی قسم کو مطابقِ حقیقت کر دیا تھا۔ یعنی ان کی بات بس اتنی تھی جس کی اگر کوئی جزا بنتی تو بس جھاڑو لگانے کے برابر ہی ہوتی۔ یہ بھی اس لیے کیا گیا کہ انھوں نے قسم کھالی تھی اور اللہ تعالیٰ کو گوارا نہ تھا کہ ان کا نبی اپنی قسم پوری کرنے سے رہ جائے۔

چنانچہ ایک طرف یہ واقعات بتاتے کہ سرکشوں کے برخلاف خدا کے نیک بندے بادشاہت اور سرداری پا کر بھی خدا سے کتنے ڈرنے والے ہوتے ہیں اور کس طرح معمولی باتوں پر بھی اس کے حضور تڑپ کر رجوع کرتے ہیں اور دوسری طرف یہ واقعات ان تمام انبیا پر لگائے گئے بہتانوں کی خوبصورتی سے تردید بھی کرتے ہیں۔ اسی کردار کے حامل لوگ ہوتے ہیں جنھیں دنیا میں بھی بھلائی ملتی ہے اور آخرت میں بھی خدا کا قرب اور انعام سے وہ نوازے جائیں گے۔

VICE

امریکہ میں ہر چار سال بعد صدارتی انتخابات ہوتے ہیں جن میں امریکی قوم اپنا صدر منتخب کرتی ہے۔صدر کے ساتھ اس کا نامزد کردہ نائب صدر(Vice President) خود بخود منتخب ہوجاتا ہے۔ دیکھنے میں یہ نائب صدر ایک بہت بڑا عہدہ لگتا ہے،مگر امریکی نظام حکومت میں نائب صدر کی حیثیت نمائشی ہوتی ہے جس کے پاس کوئی اختیار نہیں ہوتا۔اس کی حیثیت صرف یہ ہوتی ہے کہ کسی وجہ سے صدر اپنے عہدے پر باقی نہ رہے تو وہ صدر بن جائے۔وہ سینیٹ کی بھی صدارت کرتا ہے،مگر یہ بھی ایک نمائشی عہدہ ہوتا ہے۔ امریکی نائب صدر کی حیثیت اس بات سے سمجھی جاسکتی ہے کہ امریکی صدر کو عام طور پر دنیا جانتی ہے،مگر نائب صدر کے نام کا علم عام طور پر کسی کو نہیں ہوتا۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہے کہ نائب صدر کا عہدہ بس علامتی ہے اور اس کی حیثیت صدارتی ٹیم میں ایک مشیر سے زیادہ نہیں ہوتی۔اس پورے معاملے میں جارج بش جونیئر کے نائب صدر ڈک چینی کو ایک استثنا حاصل ہے۔وہ بش کے ساتھ سن 2000 کے الیکشن میں نائب صدر بنے اور اگلے آٹھ برس تک اس عہدے پر باقی رہے۔ڈک چینی صدر بش کی ٹیم کے ایک مشیر ہی نہ تھے بلکہ پس پشت رہ کر وہ عملی طور پر امریکی نظام حکومت کو چلاتے رہے۔

ان کے دور میں نائن الیون کا حادثہ ہوا اور افغانستان کے علاوہ امریکہ نے عراق پر چڑھائی کر کے دونوں ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔افغانستان پر حملے کے نتیجے میں پاکستان دہشت گردی کی زد میں آ گیا جبکہ عراق پر حملے کے نتیجے میں داعش جیسا خوفناک دہشت گرد گروہ وجود میں آیا جس نے آنے والے برسوں میں نہ صرف عراق،شام،افغانستان بلکہ پورے مشرق وسطیٰ اور دنیا بھر میں اپنی کارروائیوں میں خون کی ندیاں بہادیں۔

امریکہ کے ان تمام فیصلوں کے پیچھے اصل شخصیت ڈک چینی کی تھی۔خاص کر عراق پر حملے کے لیے امریکہ کے پاس کوئی جواز نہ تھا۔مگر ڈک چینی اور ان کے لائے ہوئے وزیر دفاع رمز فیلڈ نے غیر اہم اور مبہم معلومات کو بنیاد بنا کر عراق پر حملے کی راہ ہموار کی۔یہی وہ پس منظر ہے جس میں ڈک چینی رفتہ رفتہ غیر مقبول ہوتے چلے گئے اور تاریخ کے سب سے نامقبول نائب صدر کی حیثیت سے اپنے عہدے سے رخصت ہوئے۔

یہ باتیں عام طور پر امریکی سیاست سے واقف لوگوں کو معلوم ہیں،مگر سن 2018 میں بننے والی ایک ہالی وڈ فلم VICE میں بہت خوبی کے ساتھ پردۂ سیمیں پر منتقل کر دی گئی ہیں۔vice ایک ذو معنی لفظ ہے۔اس کا ایک مطلب نائب ہے جیسا کہ Vice President میں ہے۔ مگر اس کا دوسرا مطلب برائی ہے۔یہی فلم کا پیغام ہے کہ ڈک چینی نائب صدر کے روپ میں ایک ایسی برائی تھے جنھوں نے دنیا بھر کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا۔

اس فلم کے ذریعے سے لوگوں کو اس حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے کہ ذاتی مفادات یا مقاصد کے لیے اہم عہدوں پر آنے والے لوگ، سامنے یا پس پشت رہ کر، کس طرح اپنے فیصلوں سے ان گنت لوگوں کی زندگی کو برباد کر دیتے ہیں۔ڈک چینی کے فیصلے نہ صرف دنیا بھر کے لوگوں بلکہ ہزاروں امریکیوں کی موت کا بھی سبب بن گئے۔ اس فلم میں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کی ظاہری باتوں سے متاثر ہو کر کبھی ان کا انتخاب نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ ایسے لوگ قومی اور عوامی مفاد کے نام پر کروڑوں لوگوں کی زندگیاں اجیرن بنا دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جمہوری نظام میں عوام کی ذمہ داریاں بہت بڑھ چکی ہیں۔وہ جب بھی سطحی باتوں میں آ کر غلط لوگوں کا انتخاب کریں گے، اس کے بدترین نتائج ان کو بھگتنے پڑیں گے۔یہی وہ سبق ہے جو ہمارے ملک کے لوگوں کو جلد سے جلد سیکھنا چاہیے۔

رت جگے کاٹ کے جس نے مجھے بخشی تھی حیات

(اپنی والدہ کے انتقال پر ابو یحییٰ صاحب کی ایک تاثراتی تحریر)

میری پہلی تصنیف ''مغرب سے مشرق تک'' تھی۔ یہ کینیڈا، امریکہ اور سعودی عرب کا سفر نامہ تھا۔ اب یہ سفر نامہ کچھ اور ممالک کے تذکرے کے ساتھ ''کھول آنکھ زمیں دیکھ'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس سفر نامہ کو میں نے اپنی والدہ کے نام معنون کرتے ہوئے اپنی بہن پروین سلطانہ حنا کا ایک شعر نقل کیا ہے جو انھوں نے والدہ کے لیے ہی لکھا تھا۔

رت جگے کاٹ کے جس نے مجھے بخشی ہے حیات

اس کا چہرہ مری راتوں کے اندھیروں کا چراغ

پیش نظر مضمون کا عنوان اسی شعر کے پہلے مصرعے سے لیا گیا ہے۔ بس مصرعے میں آنے والے 'ہے' کو 'تھی' سے بدل دیا ہے۔ 'ہے' سے 'تھی' ہو جانا وہ فیصلہ الٰہی ہے جو کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ کے الفاظ میں قرآن نے بیان کیا ہے۔ پچھلے ہفتے یہ فیصلہ میری والدہ پر بھی نافذ ہو گیا۔ دو ماہ قبل میرے بھانجے عبدالسمیع کی جواں مرگ کے بعد یہ نوشتۂ دیوار تھا کہ امی جنھیں ہم سب پیاری امی کہتے تھے، وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکیں گی۔ یہ حقیقت ہے کہ جوان موت تنہا کسی فرد کی موت نہیں ہوتی بلکہ اپنا خراج لے کر جاتی ہے۔ کبھی یہ خراج کسی دوسری موت کی شکل میں ہوتا ہے اور کبھی جیتے جی مر جانے والوں کی شکل میں۔ ہم سے یہ خراج ہماری ماں کی موت کی شکل میں لے لیا گیا۔

دو مشکل ترین چیزیں اور ان سے نمٹنے کا ہتھیار

اس دنیا میں دو چیزوں کا سامنا کرنا مشکل ترین کام ہوتا ہے۔ ایک اپنے کسی جوان کی اچانک موت (Sudden Death) اور دوسرا والدین میں سے کسی کی آہستہ آہستہ آنے والی موت (Slow Death) کا سامنا کرنا۔ ہمارے خاندان نے دو مہینوں میں ان دونوں

چیزوں کا سامنا کیا۔ ان دونوں واقعات نے اس دل پر جو پہلے بھی دنیا کی بے ثباتی سے آگاہ تھا، دنیا کی بے وقعتی کو مزید کھول دیا۔

موت کے سانحات انسان کی طبیعت اور مزاج پر تباہ کن اثرات ڈالتے ہیں۔ اس لیے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے اس لیے بنایا ہی نہیں گیا کہ وہ اپنا یا اپنے کسی پیارے کا مرنا پسند کرے۔ ایک طرف انسان کی موت سے نفرت کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف اس دنیا میں موت ہی وہ واحد حقیقت ہے جسے انسان اپنی تمام تر طاقت، صلاحیت اور ترقی کے باوجود شکست نہیں دے سکا ہے۔

یہیں سے حضرات انبیا کا وہ کردار شروع ہوتا ہے جسے نبھانے وہ تشریف لاتے ہیں۔ یعنی وہ یہ بتاتے ہیں کہ خدا نے انسان کو ابدی زندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ مگر یہ ابدی زندگی اِس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت کی آنے والی ابدی دنیا میں انسان کو دی جائے گی۔ آخرت پر یہی ایمان وہ تریاق ہے جو موت کے زہر کے اثرات سے انسان کو نکال دیتا ہے۔ یہی ایمان موت جیسے سانحات کو برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔

ان دونوں سانحات سے گزر کر مجھے یہ تجربہ ہوا کہ انسان کے پاس خدا اور آخرت پر ایمان ہو تو وہ موت کی اذیت کا مقابلہ بھی کر سکتا ہے۔ ایمان بہت طاقتور چیز ہوتا ہے...... موت سے بھی زیادہ طاقتور۔ یہی ایمان وہ صبر عطا کرتا ہے جسے قرآن مجید میں کئی مقامات پر تنہا جنت میں داخلے کا سبب بتایا گیا ہے اور جس کا اجر بے حساب ہے۔

دو قسم کی کیفیات

امی کے رخصت ہونے کے ساتھ دو قسم کی کیفیات نے مجھے گھیر لیا ہے۔ دونوں کا الگ الگ پس منظر ہے۔ پہلی کیفیت وہ ہے جس میں مجھے لگ رہا ہے کہ میں ایک طویل میراتھن دوڑ میں

شامل تھا جو ختم ہوگئی ہے۔ میراتھن میں آپ فاتح قرار بھی پائیں تب بھی تکان اور نڈھال پن آپ پر غالب رہتے ہیں۔ اس بات کا پس منظر یہ ہے کہ تمام بہن بھائیوں میں سے امی میرے گھر پر رہتی تھیں۔ بیس برس اور وہ بھی بزرگوں کے بڑھاپے میں ان کو اس طرح ساتھ رکھنا کہ ایک لمحہ وہ ناراض نہ ہوں، ان کا دل مطمئن اور خوش رہے، وہ آپ سے راضی رہیں اور آخری وقت تک ان کی ذمہ داری اٹھائے رکھنا؛ یہ کام ایک میراتھن دوڑ میں مسلسل بھاگنے سے کم نہیں ہے۔

دوسری کیفیت وہ ہے جس میں امی کے جانے کے بعد یادوں نے ہر سمت بسیرا کرلیا ہے۔ ماں سے زیادہ یادیں کسی ہستی کی نہیں ہوتیں۔ پھر میری والدہ ایک انتہائی غیر معمولی خاتون تھیں۔ ان کی کچھ خصوصیات بیان کرنے کے لیے ہی میں یہ تحریر لکھ رہا ہوں تاکہ آج کی بچیوں اور بہنوں کے سامنے ایک رول ماڈل آئے۔

میری پہلی یاد اور سب سے بڑی نیکیاں

ان یادوں میں پہلی یاد کا تعلق اس وقت سے ہے جب میں اتنا چھوٹا تھا کہ امی کی گود میں آ جاتا تھا۔ شاید چار پانچ سال عمر ہوگی۔ اس زمانے میں مجھے پیٹ کی کوئی بیماری ہوگئی تھی جس سے پیٹ میں شدید درد ہوتا تھا۔ میں گھر والوں کو بس یہی بتا پاتا تھا کہ پیٹ میں تفلیک (تکلیف) ہو رہی ہے۔ ڈاکٹروں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخرکار ہسپتال داخل ہوا۔ وہاں بتایا گیا کہ آپریشن کیا جائے گا۔ امی نے صاف انکار کردیا کہ وہ اپنے بچے کا آپریشن نہیں کرائیں گی۔ اس زمانے میں آپریشن بہت خطرناک چیز سمجھا جاتا تھا۔

خیر والد صاحب دوسری جگہ لے گئے۔ وہاں الحمدللہ درست تشخیص ہوگئی اور بغیر آپریشن تکلیف بھی ختم ہوگئی۔ مگر یہ ہسپتال کافی دور تھا۔ اس زمانے میں لوگ دور دور کا سفر پیدل کیا کرتے تھے۔ امی مجھے گود میں لے کر میلوں چلتیں۔ یہی وہ یاد ہے جسے میں بیان کرنا چاہ رہا تھا

کہ ایسے ہی کسی سفر میں مَیں ان کی گود میں چڑھا ہوا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سخت گرمی میں مجھے اٹھا کر چلنے کی مشقت کے باعث ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا جس پر پسینے بہہ رہے تھے۔ مگر ان کو یہ گوارا نہ تھا کہ اپنے بچے کو زمین پر پیدل چلائیں۔

میں ان کے چہرے کو دیکھ کر ان کی مشقت کو محسوس کر رہا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے ان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ امی میں بلا (بڑا) ہو جاؤں گا تو آپ کو گوم (گود) میں اٹھاؤں گا۔ امی کے انتقال سے چند دن پہلے سب سے بڑی بہن میرے گھر میں ان سے ملنے آئیں تو اسی واقعے کے پس منظر میں مجھ سے کہنے لگیں: ریحان میاں! آپ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ ماں کے احسان اتنے ہوتے ہیں کہ ہماری کوئی خدمت ان احسانوں کا بدل نہیں بن سکتی۔ عام طور پر دینی مشن سے وابستہ لوگ والدین اور خاندان کی ذمہ داری خود نہیں اٹھاتے بلکہ کسی دوسرے بھائی کے سر ڈال دیتے ہیں۔ میں نے تو جس دین کو سمجھا ہے، اس میں جنت کی منزل جتنی نصرت دین سے ملتی ہے، اتنی ہی والدین کی خدمت سے بھی ملتی ہے۔ بیس برس قبل میں کینیڈا کی شہریت ترک کر کے پاکستان لوٹا تھا تو ایک چیز یہ بھی پیش نظر تھی کہ والدہ (والد کا بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا) کو اپنے ساتھ رکھ کر ان کی خدمت کی جائے۔ کیونکہ میں قرآن مجید کی روشنی میں یہ جانتا تھا کہ تنہا اللہ تعالیٰ کو اپنا سب کچھ بنا لینے کے بعد جو اجر والدین سے حسن سلوک کا ہے، وہ کسی اور چیز کا نہیں۔

میری والدہ کی مہمان نوازی اور سلیقہ مندی

میری والدہ نے الحمدللہ طویل عمر پائی۔ ان کی پیدائش 1932 کے لگ بھگ دہلی میں ہوئی تھی۔ نانا حکیم تھے۔ سفر کرتے رہتے تھے۔ اس لیے رنگون سے لے کر لکھنؤ تک سب جگہ گھومتی رہی رہیں۔ 1947 میں شادی ہوئی اور والد صاحب کے ہمراہ 1948 میں کراچی آ گئیں۔ یہ

وہ نسل تھی جو اب مکمل طور پر ختم ہوچکی ہے۔اس کی اپنی اقدار تھیں۔اپنی تہذیب تھی۔ اپنی روایات تھیں۔ یہ سب اسی نسل کے ساتھ ختم ہوگیا۔

اس نسل کی ایک بنیادی خصوصیت مہمان نوازی تھی۔ ہمارے والد صاحب کاروباری آدمی تھے۔روپے پیسے کی کثرت تھی۔ ہمارے ہاں سن ساٹھ کی دہائی میں اس وقت ٹی وی آ گیا تھا جب یہ نیا نیا پاکستان میں آیا تھا۔ پورے محلے کے لوگ ٹی وی دیکھنے گھر آتے۔مگر امی بہت مہمان نواز اور برداشت والی تھیں۔سب کا استقبال کرتیں۔گھر میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی مہمان رہتا تھا۔رشتہ داروں کو کھلانے پلانے کے علاوہ، تحفے تحائف دینا،ضرورت مندوں کی مدد کرنا ان کا معمول تھا۔میرے والد صاحب نے کبھی مستقبل کا سوچا نہ پیسہ بچانے کا۔جو کمالیا وہ دوسروں پر خرچ کر دیا۔ کچھ تقدیر کا فیصلہ بھی تھا کہ سن 77 کی مشہور اور تباہ کن بارشوں میں والد صاحب کی تمام انویسٹمنٹ محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً ڈوب گئی۔اس بنا پر والد صاحب کو آخری وقت میں مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔اس موقع پر امی نے اپنے سلیقے سے گھر بھی چلایا اور بہنوں کی شادیوں کی ذمہ داری بھی اچھے طریقے سے پوری کی۔

میرے ہوش سنبھالنے کے بعد میری دوسرے نمبر کی بہن (عبدالسمیع کی والدہ) کی شادی ہوئی تھی۔ یہ سن 1979 تھا۔اس موقع پر والد صاحب نے والدہ کو چند سو روپے دے کر کہا تھا کہ میرے پاس تو بس یہی کچھ ہے۔مگر امی نے بڑے سلیقے سے سارے انتظامات کیے۔اس زمانے میں شادی ہال میں شادی کرنا اور جہیز میں بیٹی کو ٹی وی دینا غیر معمولی بات تھی،مگر امی نے دیگر چیزوں کے ساتھ یہ سب کچھ بھی کیا۔

غریبوں کی عزت نفس کا خیال اور صبر

غریبوں کی مدد کے ساتھ امی کی ایک اور بڑی غیر معمولی خصوصیت غریب غربا کے ساتھ

عزت کا برتاؤ تھا۔حال یہ تھا کہ بچپن میں ہماری چپلیں گانٹھنے والے موچی جو ایک ہندو تھے، ان کو بھی ہم ماما کہتے تھے کہ وہ ہماری امی کے بھائی بنے ہوئے تھے۔اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس درجہ میں دوسروں کی عزت نفس کا خیال کرتی تھیں۔ان کی شخصیت میں بڑی وجاہت تھی، لہجہ بہت نرم اور انداز گفتگو بہت شائستہ تھا۔اس لیے ہر شخص ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

امی کا ایک اور وصف ان کا صبر تھا۔انھوں نے زندگی میں بہت مشکلات بھی دیکھیں۔ان میں خاندانی مسائل بھی تھے، مالی پریشانیاں بھی اور شوہر اور بچوں کی بیماریاں بھی۔مگر ہر پریشانی کا انھوں نے بڑے حوصلے سے سامنا کیا۔کبھی کسی ظلم کا جواب نہیں دیا۔کبھی کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں کیا۔میں نے انھیں مشکلات میں آہ وزاری کرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔بس بعض اوقات غم کے مارے ان آنسوؤں کو ان کی آنکھوں سے نکلتے دیکھا جو وہ کام کاج کے دوران میں خاموشی سے بہارہی ہوتی تھیں۔ان کے ماشاءاللہ نو بچے تھے۔اتنے بچوں کو پالنا خود ایک صبر آزما کام تھا۔مگر انھوں نے بڑی خوبی سے اس ذمہ داری کو نبھایا۔انھوں نے کئی دفعہ بچوں اور شوہر کی سنگین بیماریاں دیکھیں۔ان کے ساتھ ہسپتال رہیں۔والد صاحب آخری زمانے میں بہت بیمار رہے۔مسلسل تین برس ان کو والد صاحب کے ساتھ ہفتوں ہسپتال رہنا پڑا۔

ان سارے مراحل سے وہ بہت حوصلے کے ساتھ گزریں۔ان کی عمر کے آخری بیس برس میں جو میرے ساتھ گزرے انھیں منہ کے السر کی تکلیف ہوگئی۔اس تکلیف کا ہونا ہی ہمارے معاشرے کی زبوں حالی کی ایک کہانی ہے۔ہوا یہ تھا کہ ان کے دانتوں میں کوئی معمولی مسئلہ تھا۔ڈاکٹر نے دوا لکھی۔مگر کیمسٹ نے اصل دوا کی جگہ دوسری دوا دے دی۔اس نے ان کے منہ کی اندرونی جھلی کو سخت نقصان پہنچایا۔ایک سال کے مسلسل علاج کے بعد وہ کچھ کھانے پینے کے قابل ہوئیں، مگر ساری زندگی کے لیے مرچ مصالحے کے استعمال کے قابل نہ رہیں کہ ان سے

منہ میں سخت جلن شروع ہو جاتی تھی۔ اپنی اس بیماری کو بھی انھوں نے بڑے حوصلے سے برداشت کیا۔ مگر رفتہ رفتہ اس چیز نے ان کی خوراک کو بہت کم کر دیا اور بتدریج بہت کمزور ہوتی چلی گئیں اور آخری وقت میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھیں، مگر کبھی انھوں نے شکوہ شکایت نہیں کیا۔

بچوں کی تربیت اور نرم مزاجی

امی کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ مجھے مطالعے کی جتنی کچھ عادت ہوئی، اس میں والدہ کا بڑا عمل دخل تھا۔ وہ روزانہ سہ پہر کے وقت سارے کاموں سے فارغ ہو کر لیٹ جاتیں اور کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتیں بلکہ ہمیں بھی پڑھ کر سناتیں۔ ان میں نہ صرف مذہبی کتابیں شامل تھیں بلکہ ڈیل کارنیگی جیسے لوگوں کی کتابیں بھی شامل تھیں۔ انھیں انگریزی نہیں آتی تھی اس لیے اس طرح کی کتابوں کے تراجم پڑھتی تھیں، مگر انگریزی سیکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ مجھ سے اکثر انگریزی الفاظ کے ہجے اور لکھنے کا طریقہ وغیرہ پوچھتی رہتی تھیں۔

اپنے بچوں کی تربیت کی انھیں بہت فکر تھی، بچوں کی تربیت کے لیے ان پر کچھ سختی کرنی پڑتی ہے۔ دوسری طرف سختی کرنا امی کا مزاج ہی نہیں تھا۔ انھوں نے ساری زندگی اپنے کسی بچے کو نہ مارا نہ ڈانٹا۔ جب بچے بہت تنگ کرتے تو یہ کہہ کر ڈراتی تھیں کہ اللہ کی رحمت آ جا۔ مجھے قرآن کریم وہی پڑھاتی تھیں اور میں قرآن پڑھنے کا چور تھا۔ چنانچہ بڑی مشکل سے ان کے ہاتھ آتا تھا۔ جب اس حوالے سے بہت تنگ کرتا تو آخری دھمکی یہ دیتی تھیں کہ دست پناہ (چمٹے) سے پٹائی کروں گی۔ میرے تمام تر بھگوڑے پن کے باوجود یہ دھمکی بھی کبھی حقیقت نہ بن سکی۔ تاہم انھوں نے اس طرح کے سارے مسائل کو اپنی مضبوط قوت ارادی اور مستقل مزاجی سے حل کیا۔ وہ اتنے تواتر سے ہمارے پیچھے پڑی رہتی تھیں کہ چھ کلمے، نماز، متعدد قرآنی سورتیں انھوں نے ہمیں یاد کرادی تھیں۔ اچھی عادتیں اور اچھے اخلاق کی تربیت اس کے علاوہ ہے۔

اللہ میاں سے کہہ دو

وہ آخری وقت تک ہمیں کچھ نہ کچھ سکھاتی رہیں۔ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ جب کوئی معاملہ حل نہ ہوتو اسے اللہ میاں سے کہہ دو۔اللہ میاں مسئلے کو حل کر دیں گے۔آخری دو تین دن میں امی کی تکلیف بہت بڑھی تو ان کی وفات کے دن میں نے اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کی تھی کہ یہ میری ماں نے مجھے سکھایا ہے کہ کوئی مسئلہ حل نہ ہوتو اللہ میاں سے کہہ دو۔موت وزندگی کے فیصلے آپ کرتے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ اس میں کسی کی دعا اور فریاد کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی کہ یہ ایک مقرر نوشتہ ہوتا ہے جو اپنے وقت پر ظاہر ہوتا ہے۔لیکن اپنی مقررہ تقدیر کو آپ جانیں، میں تو یہ جانتا ہوں کہ میری ماں نے مجھے آخری حل یہ سکھایا ہے کہ آپ سے براہ راست بات کر لی جائے۔میں نے آپ سے کہہ دیا ہے کہ میری ماں کی تکلیف دور کر دیں۔آپ کی توحید اور آپ کی لکھی ہوئی تقدیر میں سے کون زیادہ اہم ہے،اس کا فیصلہ آپ کرلیں۔

اسی روز اللہ تعالیٰ نے امی کی ساری تکلیف کو ختم کر کے ان کو اپنے پاس بلالیا۔مجھ پر واضح ہوگیا کہ توحید تقدیر سے زیادہ بڑی چیز ہے۔خدا کی رحمت اور غیرت ہر چیز پر غالب ہے۔حتیٰ کہ کے اس کے اپنے فیصلوں پر بھی۔

اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور پہلو سے امی کی لاج رکھی۔امی ساری زندگی یہی کہتی رہی تھیں کہ انھیں ہسپتال نہیں جانا۔مگر جب ان کی طبیعت بگڑی تو میں نے ایمبولینس گھر پر بلوائی۔مگر عین اس وقت جب ایمبولینس گھر کے دروازے پر پہنچی، اللہ تعالیٰ کے فرشتے اللہ کی بندی کو انسانی دنیا کی ساری تکالیف سے نکال کر خدا کی اس دنیا میں لے گئے جہاں اعلیٰ اخلاق، نرم مزاج اور خداترس لوگوں کے لیے نعمتوں کے ابدی باغ ہیں۔

تین خواتین

امی کی یادوں کی ایک بارش ہے جو دل کی دنیا پر ہو رہی ہے، مگر ان مختصر صفحات میں کس کس بات کو بیان کیا جائے۔ یہ یادیں تا زیست میرے لیے سرمایہ رہیں گی۔ اس سرمائے میں سے کچھ حصہ قارئین اور خاص کر خواتین قارئین کے ساتھ صرف اس لیے شیئر کیا ہے کہ کچھ بہنیں اگر ان عادتوں اور مزاج کو اختیار کرلیں تو یہ بھی میری والدہ کے لیے ایک صدقہ جاریہ ہوگا اور خود ان کے لیے دنیا و آخرت میں بھلائیوں کے حصول کا ذریعہ بن جائے گا۔

میں نے اپنی بیشتر زندگی عملی طور پر جن تین خواتین کے ساتھ گزاری ہے، میری والدہ ان میں سے پہلی ہیں۔ باقی دو میں میری بہن پروین سلطانہ حنا جو میرے ساتھ ہی رہتی ہیں اور میری اہلیہ ہیں۔ یہ تینوں اپنی ذات میں صبر، خدمت اور قربانی کا ماڈل ہیں۔ ان کی بنا پر ہی میرا گھر ہمیشہ میرے لیے ایک پرسکون جگہ رہا ہے۔ میرا سارا دعوتی کام ان کی پشت پناہی اور تعاون کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔

میں جب آج کل کی لڑکیوں کا مزاج دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی اصل ترجیح ان کی اپنی ذات ہے۔ ان کی خواہشات، ان کے خواب اور ان کی خوشیاں؛ اس سے زیادہ ان کے لیے کچھ اہم نہیں۔ ان میں سے کوئی چیز غلط نہیں، مگر یہ چیزیں زندگی بن جائیں تو انسان خودغرض اور بے حس ہو جاتا ہے۔ آخرت کی کامیابی خواہش، خواب اور خوشیوں ہی میں جینے سے نہیں ملتی، یہ اپنی ذات سے بلند ہو کر صبر، خدمت، قربانی اور محبت دینے سے ملتی ہے۔

اپنی والدہ کی کچھ یادیں اسی لیے ضبط تحریر میں لایا ہوں کہ آج کل کی خواتین اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کریں۔ وہ یہ کریں گی تو ان کا گھر جنت بنے گا، اولاد صدقہ جاریہ بن کر اٹھے گی اور آخرت کی فلاح نصیب ہوگی۔ نہیں کریں گی تو شاید دنیا میں کچھ وقتی راحتیں مل جائیں، ابدی زندگی میں کوئی بلند مقام حاصل کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔

ابو یحییٰ

سیاست میں رائے قائم کیسے کریں؟

سوال: السلام علیکم۔

آج کل سیاست میں پروپیگنڈا کا دور ہے۔ میڈیا اور سوشل میڈیا پر ہر سیاسی پارٹی اور ان کے حمایتی اپنے نقطہ نظر کو درست ثابت کرنے کے لیے اعداد و شمار کا گورکھ دھندا اور دلائل کے انبار لگا دیتے ہیں۔ جھوٹ کو سچ ثابت کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ایسے میں ہم کسی صحیح نتیجے پر کیسے پہنچ سکتے ہیں؟

جواب: السلام علیکم۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

آپ نے بالکل درست فرمایا ہے کہ میڈیا اور سوشل میڈیا پر سچ اور جھوٹ کی تمیز کرنا کسی عام آدمی کے لیے آسان نہیں ہے۔ چاہے کوئی شخص دیانتداری سے کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہو۔ تاہم ہمارے پاس ایک ایسا راستہ ہے جس کے ذریعے سے ہم کسی بھی سیاسی لیڈر کے اخلاص اور اس کی صلاحیت دونوں کو پرکھ سکتے ہیں۔ وہ آسان طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی سیاسی لیڈر کے بیانات اور وعدوں کا تقابل جو اس نے حکومت سے باہر رہ کر دیے ہوں، اس کے اس عمل اور باتوں سے کر لیں جو وہ اقتدار میں آنے کے بعد کرتا ہے۔ آج کل کے میڈیا کے دور میں ہر لیڈر کے پچھلے بیانات بھی موجود ہوتے ہیں اور اس کی حکمرانی کے نتائج بھی لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں۔ اور کسی کے لیے ان کو جھٹلانا ممکن نہیں ہوتا۔

چنانچہ سادہ اصول یہ ہے کہ سیاسی لیڈروں کے وعدے اور بیانات، اقتدار میں آنے کے بعد ان کی باتوں اور عمل سے جتنے دور ہوں گے ان کا اخلاص اور اہلیت اتنی ہی مشکوک ہوگی۔ کوئی لیڈر اگر اپوزیشن میں رہ کر کچھ وعدہ کرتا ہے اور اقتدار میں آنے کے بعد ان کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا اصل ہدف عوام کی خدمت نہیں بلکہ

اقتدار تھا۔ دوسرا مطلب یہ کہ اس شخص میں یہ اہلیت ہی نہیں کہ اپنے وعدے کو ایفا کر سکے۔ پہلی چیز اس کے اخلاص اور دوسری اس کی اہلیت کو مشکوک کر دیتی ہے۔

یہ سادہ بات کسی خاص دور یا سیاستدان کے بارے میں نہیں بلکہ ہر دور اور ہر لیڈر کی پرکھ کا سب سے آسان ذریعہ ہے۔ پاکستان کی تمام اہم سیاسی جماعتیں اقتدار اور اپوزیشن دونوں دیکھ چکی ہیں۔ اس بنیاد پر آپ با آسانی ان کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

ہم یہاں دو مزید باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہیں گے۔ ایک یہ کہ حضرات انبیا اور خلفائے راشدین کے علاوہ کوئی ایسا نہیں جس کے قول و فعل میں کسی قسم کا تضاد نہ ہو۔ وہ لوگ اخلاقیات کا آخری نمونہ تھے جن کا اخلاقی قد و قامت ہمالیہ کی طرح بلند تھا۔ ان کے جیسا ہونا ممکن نہیں۔ ہم کو بس اسی چیز پر اکتفا کرنا چاہیے کہ دستیاب لوگوں میں سے کون بہتر ہے یا کون کم برا ہے۔ ہمیں سیاسی لیڈروں کو فرشتہ یا شیطان سمجھنے کے بجائے بہتر سے بہتر کی تلاش جاری رکھنی چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ سیاسی لیڈروں کے جو حمایتی اپنے تعصّبات، محبت و نفرت کے جذبات میں اندھے ہو کر کسی لیڈر کی یکطرفہ حمایت و مخالفت میں سرگرم رہتے ہیں، انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت احتساب حکمرانوں کا ہو گا۔ کیونکہ ان کی پالیسیوں اور رویوں سے کروڑوں لوگوں کی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ اس انتہائی سخت احتساب کے موقع پر ان لوگوں کو بھی حکمرانوں کے ساتھ کٹہرے میں بلا لیا جائے گا جو ان کی یکطرفہ حمایت کرتے ہیں۔ اگر لیڈر پر غفلت، نااہلی، جھوٹ اور کرپشن کا الزام ثابت ہو گیا تو ان جرائم کا ایک حصہ ان اندھے حمایتیوں کے کھاتے میں بھی لکھ دیا جائے گا کیونکہ ان کی یکطرفہ حمایت ان لیڈروں کی سب سے بڑی طاقت تھی۔

اب جس شخص میں یہ حوصلہ ہے کہ اپنے گناہوں کے ساتھ اپنے لیڈروں کے جرائم کو بھی بھگتیں، وہ ضرور یہ راستہ اختیار کریں۔ باقی رہا ایک بندہ مومن تو وہ کسی مذہبی یا سیاسی لیڈر کا نہیں بلکہ اپنے رب کا غلام ہوتا ہے اور ہمیشہ حق کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ چاہے وہ اس کو پسند ہو یا ناپسند۔ چاہے وہ اس کے جذبات و تعصّبات کے خلاف ہو یا نہیں۔

مولانا وحید الدین خان

مسلمان کی اصل حیثیت

اپنی اصل حیثیت کے اعتبار سے، مسلمان داعی ہیں اور دوسری تمام اقوام ان کی مدعو، یعنی مسلمان خدا کے امین ہیں اور ان کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اس امانت کو تمام انسانوں تک پہنچائیں۔ اسی فرض کی ادائیگی میں ان کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک انتہائی نازک خدائی ذمے داری کا معاملہ ہے۔ مسلمان اپنی اس ذمے داری کو صرف اس وقت ادا کر سکتے ہیں، جب کہ وہ اس ذمے داری کے تقاضوں کو سمجھیں اور اس کو اپنی زندگی میں بھرپور طور پر استعمال کریں۔ داعی کی ذمے داری صرف داعیانہ کردار کے ساتھ ادا کی جا سکتی ہے، داعیانہ کردار کے بغیر دعوتی ذمے داری کو ادا کرنا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح کسی عورت کے لیے مادرانہ شفقت کے بغیر ماں کی ذمے داری کو ادا کرنا۔ قرآن کے الفاظ میں، دعوت کا آغاز نصح (7:68) سے ہوتا ہے، یعنی مدعو کے لیے یک طرفہ خیر خواہی۔ دعوتی اخلاق کا تقاضہ ہے کہ داعی کے دل میں اپنے مدعو کے لیے صرف مثبت جذبات ہوں، منفی جذبات سے اس کا دل مکمل طور پر خالی رہے۔ اسی کا نام یک طرفہ خیر خواہی ہے۔ اس قسم کی یک طرفہ خیر خواہی کے بغیر داعی اپنی داعیانہ ذمے داری کو ادا نہیں کر سکتا۔

موجودہ دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں ہمیشہ ایک شخص کو دوسرے شخص سے، اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے ناخوشگوار تجربات ہوتے رہتے ہیں، ایک کی کوئی بات دوسرے کے لیے اشتعال انگیزی کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ فطرت کا نظام ہے، اور فطرت کے نظام کو بدلنا ہرگز کسی کے لیے ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں، داعی کے اندر اپنے مدعو کے لیے یک طرفہ خیر خواہی کا جذبہ صرف اس وقت برقرار رہ سکتا ہے، جب کہ وہ یک طرفہ اخلاقیات کے اصول پر قائم ہو۔

لوگوں کے ساتھ اس کی روش دوسروں کے عمل کے زیر اثر نہ بنے، بلکہ وہ اس کے اپنے سوچے سمجھے اصول کے تحت بنی ہو۔ وہ ردعمل کی نفسیات سے مکمل طور پر خالی ہو۔

مسلمان داعی گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے، مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ دوسری قوموں کے خلاف شکایت اور احتجاج کی تحریک چلائیں۔ داعیانہ شریعت میں، شکایت اور احتجاج کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ کیونکہ مسلمان جس قوم کے خلاف شکایت اور احتجاج کی تحریک چلائیں گے، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک مدعو قوم ہوگی۔

مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنی مدعو قوم کے ساتھ حریف قوم جیسا معاملہ کریں۔ مسلمانوں کو ہر حال میں اور ہر قوم کے ساتھ ہمیشہ معتدل تعلق کو برقرار رکھنا ہے۔ کیونکہ معتدل تعلقات کے ماحول ہی میں دعوت الی اللہ کا کام ہوسکتا ہے۔ جہاں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان معتدل تعلقات نہ ہوں، وہاں دعوت کا کام انجام دینا ممکن ہی نہیں۔

قرآن کی سورہ الاحزاب میں ایک حکم ان الفاظ میں آیا ہے: یعنی ان کی ایذاؤں کو نظر انداز کرو، اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ (33:48) اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان سے نہ مانگ کر اللہ سے مانگو، مطالباتی طریقہ چھوڑ کر دعا کا طریقہ اختیار کرو۔ اسی لیے ہر پیغمبر نے اپنی مدعو قوم سے کہا: یعنی میں تم سے کسی مادی فائدے کا طالب نہیں ہوں۔ (11:11) میں صرف دینے والا ہوں، نہ کہ تم سے کوئی چیز لینے والا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مدعو قوم کے مقابلے میں، حقوق کے نام پر مطالباتی مہم چلانا، پیغمبرانہ سنت کے مطابق، سرے سے جائز ہی نہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہوگئی۔ مگر جو چیز ختم ہوئی، وہ نبوت ہے، نہ کہ کار نبوت۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اب کوئی نیا پیغمبر آنے والا نہیں۔ لیکن جہاں تک پیغمبر کے دعوتی مشن کی بات ہے، وہ ہمیشہ اور ہر قوم کے درمیان جاری رہے گا۔ پیغمبر کے دعوتی مشن میں ہر شخص کی ذمے داری ہے کہ بقدر استطاعت اپنا حصہ ادا کرے۔

ڈاکٹر محمد عقیل

کرونا وائرس: نیچر کا انتقام (1)

درسگاہیں بند، سوشل تقریبات معدوم، عبادتی مراکز خالی، سڑکیں سنسان اور بازار ویران غرض ہر طرف ہو کا عالم ہے۔ لوگ ہاتھ ملانے سے گریزاں اور ایک دوسرے سے دور بھاگ رہے ہیں۔ عوام تو عوام، سربراہان مملکت گوشہ نشین ہونے میں عافیت محسوس کررہے ہیں۔

یہ سب کیا ہے؟ مذہبی لوگوں کے ذہن میں سوال گونج رہا ہے کہ اگر خدا ہے تو وہ کیوں مداخلت نہیں کررہا اور کیوں انسانوں کو اس بے بسی کے عالم میں مرتے دیکھ رہا ہے؟ غیر مذہبی لوگ سوچ رہے ہیں کہ آخر کب سائنس ترقی پا کر ان وباؤں کو پیدا ہونے سے قبل ہی ختم کرے گی؟ سائنسدان اس تحقیق میں غلطاں ہیں کہ یہ وائرس کیوں پھوٹا اور اس کا علاج کیا ہے؟ مفکرین حیران ہیں کہ آیا نیچر کا عمل محض ایک عمل ہے یا ردعمل؟ کیا یہ محض اسباب وعلل کی اندھی کارستانی ہے یا اس کے پیچھے کوئی باشعور قوت ہے؟ دانشور پریشان ہیں کہ اس کی ذمہ دار نیچر کی اندھی طاقتیں ہیں یا انسانوں کا کوئی عمل؟ آیئے ان سوالوں کا جواب تاریخ، عقل اور نیچر کے قوانین کی روشنی میں تلاش کرتے ہیں۔

پہلا مقدمہ یہ ہے کہ مذہب اس نیچر کے پیچھے خدا کا خفیہ ہاتھ بیان کرتا ہے جبکہ غیر مذہبی مکتبہ فکر اسی نیچر کو اصل محرک مانتا ہے۔ گویا خواہ مذہبی لوگ ہوں یا غیر مذہبی اشخاص سب جس چیز پر متفق ہیں وہ ہے قدرت یا نیچر کے قوانین۔ اس لیے اگر ہم نیچر کے قوانین پر متفق ہو جائیں تو دونوں مکاتب فکر کو ایڈریس کیا جاسکتا ہے اور ان تمام سوالوں کا جواب دیا جاسکتا ہے۔

نیچر کے قوانین

سب سے پہلے ہم نیچر کے چند قوانین کا جائزہ لیتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ نیچر یا قدرت فزکس، کیمسٹری، بائیولوجی اور دیگر مادی قوانین پر کھڑی ہے اور یہ تمام قوانین بیلنس یا توازن کے اصول پر قائم ہیں۔ جب بھی انسان ان قوانین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا ہے تو نیچر ری ایکٹ

کر کے اس کا رسپانس دیتی ہے۔ مثلاً کوئی اگر کشش ثقل کے اصول کا خیال نہ کرے تو اونچی جگہ سے چھلانگ لگانے پر وہ زخمی یا موت سے ہمکنار ہوجاتا ہے، جب وہ زہریلی غذا کھاتا تو ہے نقصان اٹھاتا ہے، جب وہ آگ کے استعمال میں بے احتیاطی کرتا ہے تو جل کر راکھ ہوجاتا ہے۔ ہوائی جہاز نیوٹن کے تیسرے قانون کی خلاف ورزی کرے تو زمیں بوس ہوجاتا ہے، پانی کا جہاز ارشمیدس کے قانون کے تحت نہ چلے تو سمندر برد ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ نیچر ان مادی قوانین کے علاوہ کس اصول پر کھڑی ہے اور کن غیر مادی بنیادوں پر اس کا بیلنس برقرار رہتا ہے؟ اس کے ساتھ ساتھ نیچر غیر مادی اصولوں پر بھی کھڑی ہے۔ اس کائنات کا پچانوے فی صد سے زائد حصہ وہ ہے جو مادی دنیا میں شامل نہیں اور جسے ڈارک میٹر اور ڈارک انرجی کہا جاتا ہے۔ اس کی موجودگی کی بنا پر یہ بات یقینی ہے کہ یہ غیر مادی بنیادوں پر قائم ہے اور انہی بنیادوں پر مادی قوانین وجود میں آتے ہیں جن سے بیلنس یا توازن پیدا ہوتا ہے۔

چنانچہ نیچر غیر مادی بنیادوں پر بھی کھڑی ہے۔ ان بنیادوں میں سب سے اہم اخلاقی بنیادیں ہیں۔ مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ نیچر فلاح یعنی ویلفیئر کے اخلاقی اصول پر کھڑی ہے اور اس فلاح کا بنیادی مقصد مخلوق کو ایک ایسا ماحول فراہم کرنا ہے جس کے ذریعے مخلوق کو ارتقا کے لیے ایک سازگار ماحول فراہم کیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ سورج ہزاروں سالوں سے خود کو جلا کر حرارت اور روشنی فراہم کررہا، درخت خود دھوپ جھیل کر سایہ اور ایسے پھل فراہم کرتا ہے جو وہ خود نہیں کھا سکتا، بادل بارش کے ذریعے دھرتی کو سیراب کرتا، زمین اپنا سینہ چاک کر کے غذا فراہم کرتی ہے۔

چنانچہ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ کائنات مادی قوانین کی طرح کچھ اخلاقی اور غیر مادی اصولوں پر کھڑی ہے اور یہ اصول فلاح، بے غرضی اور نفع بخشی کا اصول ہے۔ نیچر اس اصول پر بھی اسی طرح ری ایکٹ کرتی ہے جیسے مادی قوانین کی خلاف ورزی پر۔ جب بھی انسان یا اس کے

مخصوص طبقات نے خودغرضی، وسائل کے ضیاع، طاقت کا بے جا استعمال، عدم مساوات اور ظلم وستم کے ذریعے کائنات کے اس توازن کو چھیڑنے کی کوشش کی، نیچر نے ری ایکشن کے ذریعے انسان کو نہ صرف وارننگ دی بلکہ اس کی سزا بھی دی۔

مثال کے طور پر انسان نے ترقی کے نام پر ماحول میں آلودہ گیسوں کے ذریعے اوزون کو نقصان پہنچایا تو نیچر نے گلوبل وارمنگ کے ذریعے اس کا جواب دیا۔ جب خودغرضی کی بنیاد پر درختوں کا قتل عام کیا گیا تو ہیٹ ویو نے ناطقہ باندھ دیا۔ جب جنگلوں کو تمدن کے دھوکے میں صاف کردیا گیا تو سیلابوں نے انسانی بستیوں کا صفایا کردیا، جب انسانوں نے گندگی پھیلائی تو وبائی امراض کے ذریعے نیچر نے تنبیہ کی۔

تاریخ کا ظلم اور نیچر کا ردعمل

کیا کرونا وائرس کی عالمی وبا بھی نیچر کا کوئی ری ایکشن ہے؟ کیا یہ نیچر کی کوئی وارننگ ہے؟ اگر ہاں تو انسان سے ایسی کون سی غلطی ہوئی کہ نیچر نے اتنا شدید ردعمل دکھایا؟ اس سوال کا جواب ہمیں تاریخ میں واضح طور پر نظر آتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے۔

انسان کی جدید تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جس کی بنیاد پر بے پناہ ایجادات ہوئیں اور لائف اسٹائل یکسر تبدیل ہوکر رہ گیا۔ پہلا صنعتی انقلاب اسٹیم انجن کی دریافت جو 1760 میں ہوئی سے شروع ہوکر 1850 پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس انقلاب کا زیادہ تر اثر برطانیہ میں رہا اور بتدریج یورپ میں پھیلا۔ دوسرا صنعتی انقلاب 1870 سے شروع ہوکر کم وبیش 1914 تک جاری رہا اور اس کی بنیاد بجلی کا استعمال تھا۔ اس کے بعد تیسرا انڈسٹریل انقلاب شروع 1969 میں ہوتا ہے۔ اسے انفارمیشن ایج بھی کہا جاتا ہے اور اس کی بنیاد کمپیوٹر ہے۔ اب انسان چوتھے انڈسٹریل ایج کے دروازے پر دستک دے رہا ہے جسے مصنوعی ذہانت کا دور یا سائبر ایج کہا جاسکتا ہے۔

ہم بہت زیادہ ماضی میں نہیں جاتے اور صرف اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ جب انسان دوسرے انڈسٹریل انقلاب سے انفارمیشن اتیج میں داخل ہوا تو کیا ہوا تھا اور کیوں ہوا تھا؟ اگر ہم یہ بات سمجھ لیں تو موجودہ کرونا وائرس کی وبا کا پس منظر بھی سمجھ میں آ جائے گا اور اس بات کا بھی کسی حد تک اندازہ ہو جائے گا نیچر کے کیا ارادے ہیں، کیا ہونے والا ہے اس کا تدارک کیسے ممکن ہے؟

آیئے، پہلے صنعتی انقلاب (۱۷۶۰-۱۸۵۰) اور دوسرے صنعتی انقلاب (۱۸۷۰- ۱۹۱۴) کا جائزہ لیتے ہیں کہ کس طرح اس دور میں انسان نے نیچر کے بیلنس کو متاثر کرنے کی کوشش کی اور نیچر نے کس طرح ری ایکٹ کر کے انسانیت کو وارننگ دی۔ اس دور میں اسٹیم انجن کی دریافت کے بعد انڈسٹری کے دور کا آغاز ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایجادات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس سے انسان کا لائف اسٹائل یکسر تبدیل ہو گیا اور آسانی اور تعیش کے ایک نئے دور نے سانسیں لینا شروع کیں۔

یہ تمام دریافتیں اور ایجادات تمام انسانوں کی فلاح کے لیے تھیں۔ لیکن ماضی کی طرح اس دور میں بھی مخصوص طبقات نے ان پر قبضہ جمانا شروع کر دیا اور انہیں محض اپنی دولت، عیش و عشرت، طاقت، ہوس اقتدار اور سلطنت کے عروج کے لیے حاصل کرنے کی جنگ شروع کر دی۔ چنانچہ صنعت کاروں نے مزدوروں کا بری طرح استحصال کر کے ان کی لاشوں پر اپنا تاج محل تعمیر کرنا شروع کیا۔ سرمایہ داروں نے دولت جمع کرنے کی ہوس میں امیری اور غریبی کی ناقابل بیان فصیل کھڑی کر دی۔

عالمی سطح پر یہ دور اپنے ساتھ ظلم پر مبنی نظام لے کر آیا۔ عالمی طاقتوں نے غریب ملکوں کو اپنی کالونی بنانا شروع کر دیا۔ قوم پرستوں نے اپنے اقتدار کے حصول کے لیے ایجادات کا رخ آتشی اسلحے کی جانب موڑ دیا۔ بین الاقوامی تاجروں نے تجارت کے نام پر غریب قوموں کی دولت اپنے ملک منتقل کرنی شروع کر دی۔

گویا اس دور کے استحصالی طبقات اور ریاستوں نے خود غرضی، مادیت پرستی، نسل پرستی، ظلم و زیادتی اور استحصال کی نئی داستانیں رقم کیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس انڈسٹریل ایج نے گیسوں کے اخراج سے ماحول کو تباہ کرنا شروع کردیا۔ چنانچہ نیچر نے ری ایکٹ کیا۔

سب سے پہلا ری ایکشن پہلی جنگ عظیم تھی جس کا آغاز بظاہر ایک قتل سے ہوا لیکن حقیقت میں اس کے پیچھے یہی عوامل تھے جو اوپر بیان ہوئے۔ یہ جنگ 1914 میں شروع ہوئی اور 1918 میں ختم ہوئی اور اس میں 17 ملین لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اسی پیریڈ کے دوران ایک اور بڑا جھٹکا نیچر کی جانب سے دیا گیا جو کرونا وائرس سے ملتا جلتا ہے۔ یہ کم و بیش سو سال قبل کا واقعہ ہے جب یورپ میں ایک فلو پھیلا جس کا نام اسپینش فلو کہلاتا ہے۔ اس کا آغاز جنوری 1918 میں ہوا اور اختتام دسمبر 1920 میں ہوا۔ اس فلو سے یورپ، امریکہ، چائنا سمیت پوری دنیا میں تباہی پھیل گئی اور جدید تحقیق کے مطابق اس میں سو ملین کے قریب لوگ موت سے ہمکنار ہوئے۔ یوں دنیا کی پانچ فی صد سے زیادہ آبادی اس فلو کے نتیجے میں ختم ہوگئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ کاروبار بھی بری طرح متاثر ہوا۔ یہ فلو مختلف لہروں کی صورت میں دنیا پر مختلف وقفوں سے دنیا پر مسلط رہا اور یہ دنیا کی چند تباہ کن وباؤں میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے۔

لیکن معاملہ یہاں نہیں تھما استحصال کا سلسلہ عالمی سطح پر جاری رہا۔ سرمایہ دارانہ نظام جو استحصال پر مبنی تھا اس نے امریکہ میں عظیم معاشی ڈپریشن کو جنم دیا۔ اس کے بعد ہی یورپ میں فاشزم اور نازی ازم کو ہوا ملی۔ یہاں تک کہ 1939 میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی جو 1945 تک جاری رہی۔ اس جنگ میں 75 ملین لوگ ہلاک ہوئے جو اس وقت کی آبادی کا تین فی صد ہے۔ یہ جنگ نیشنلزم، فاشزم، میٹیریل ازم، خود غرضی، ظلم، استحصال اور جبر جیسے رویوں کا نتیجہ تھی۔ اس جنگ میں انڈسٹریل ریوولیوشن کا حصہ بننے والے تمام ہی طبقات نے بالواسطہ یا بلاواسطہ حصہ لیا جن میں سرمایہ دار، صنعت کار، سائنسدان، سیاست دان، ریاستیں،

فوج اور عوام شامل تھے۔

یوں ہم دیکھیں تو 1914 سے لے کر 1945 تک ان تین بڑے واقعات کے ذریعے نیچر نے انسانوں کو اس بیلنس اور توازن کو بگاڑنے کی سزا دی۔ بیسیویں صدی میں لگ بھگ 200 ملین لوگ جنگوں اور وباؤں کے باعث ہلاک ہوئے جو اس وقت کی آبادی کا کم وبیش نو فی صد تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ نیچر نے یہ سزا ان کے گذشتہ سو سالوں کے اعمال کے جواب میں دی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد انسانوں اور استحصالی طبقات کے پاس سبق لینے کے اور خود کو سدھارنے کے علاوہ کوئی آپشن نہ تھا۔ اس کے بعد مغربی ملکوں نے قبضہ کیے ہوئے ممالک کو آزاد کرنا شروع کر دیا۔ جنگ کے بجائے ڈائیلاگ کے لیے لیگ آف نیشن کی جگہ اقوام متحدہ وجود میں آیا۔ یورپ میں تفرقے کو ختم کرنے کے لیے یورپین اکنامک کمیونٹی بنی جسے آج یورپین یونین کہتے ہیں۔ تباہ شدہ یورپ کو دوبارہ تعمیر کرنے کے لیے ورلڈ بینک کو بنایا گیا جبکہ بیلنس آف پے منٹ کے خسارے کو ختم کرنے میں مدد دینے کے لیے آئی ایم ایف بنا۔ انٹرنیشنل تجارت کو سپورٹ کرنے کے لیے انٹرنیشنل ٹریڈ آرگنائزیشن وجود میں آئی۔ ان سب اداروں کا مقصد ماضی کی خطاؤں سے توبہ کر کے نسل پرستی، فاشزم، ظلم اور استحصال کا خاتمہ اور ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد و یگانگت کی فضا قائم کرنا تھا۔ یعنی یہ وہی فلاح کا اصول تھا جس پر نیچر کھڑی ہے اور انسانوں کو کھڑا ہونے کی دعوت دیتی ہے۔

گویا جو بات انسان آسانی سے نہیں سمجھ پائے وہ نیچر نے اپنے ری ایکشن کے ذریعے سمجھا دی کہ نیچر کا نظام توازن کے اصول پر قائم ہے جس کی بنیاد فلاح ہے۔ جو بھی فلاح کے اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نیچر کے توازن کو برباد کرتا ہے وہ خود برباد ہو جاتا ہے۔ اور جو اس توازن کو برقرار رکھتا ہے، وہ ارتقا کے مراحل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

موجودہ کرونا وائرس اور انسانیت کا مستقبل

ایک تحقیق کے مطابق نیچر نے کم وبیش سوسال بعد دوبارہ انسانوں کو جھنجوڑنا شروع کیا ہے۔ وہ اسپینش فلو جو سوسال قبل آیا تھا، آج دوبارہ کسی نئے وائرس کے ذریعے انسانوں پر مسلط کردیا گیا ہے۔ آخر وہ کون سے بڑے جرائم ہیں جن کی بنا پر نیچر یہ قدم لینے پر مجبور ہوئی؟

ہم نے دوسری جنگ عظیم کے بعد کچھ عرصے تک درست سمت میں قدم بڑھایا اور انسان کی مجموعی فلاح کو مدنظر رکھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد وہی قوتیں حرکت میں آ گئیں جو ترقی میں اپنا حصہ اپنی استطاعت سے زیادہ لینے کی کوشش کرتی ہیں خواہ اس کے لیے انہیں کسی بھی حد تک جانا پڑے۔

سوویت یونین نے جبر پر مبنی ایک نظام اپنایا جس کا بعد میں خاتمہ ہوگیا۔ اس سرد جنگ کے خاتمے کا ایک منفی اثر یہ ہوا کہ سرمایہ دارنہ نظام دوبارہ آزاد ہوگیا اور وہ تحریک جو ویلفیئر اسٹیٹس کے قیام سے شروع ہوئی تھی، دم توڑ گئی۔ ترقی یافتہ قوموں نے اپنی قوم کے لیے تو عدل وانصاف پر مبنی نظام نافذ کیا لیکن کمزور قوموں کو آزادانہ تجارت، قرض، اسلحہ، ٹیکنالوجی اور سائنسی ترقی کے بل بوتے پر غلام بنانا شروع کردیا۔ یوں عالمی سطح پر معاشی اور سماجی ناہمواریوں کی ظالمانہ داستان دہرائی جانے لگی۔

عالمی ادارے جن کا مقصد کمزوروں کی مدد کرنا تھا وہ خود طاقتور کے ہاتھوں یرغمال بن گئے۔ چنانچہ اقوام متحدہ کی کوئی خاص حیثیت نہ رہی، آئی ایم ایف معاشی ترقی کے بجائے استحصال کرنے لگا، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن تجارت کے فروغ کی آڑ میں غریب ملکوں کو مزید غریب کرنے لگی۔ وہ ممالک جو نیچرل ریسورسز میں مالا مال تھے وہاں طاقتور ملکوں نے ڈیرے ڈال لیے اور ان کے ریسورسز پر کبھی جنگ اور کبھی چال کے ذریعے قبضہ کرلیا۔ جو ممالک غریب تھے وہاں چند طاقتور طبقوں کو اقتدار دے کر طاقتور ممالک نے اپنے بالواسطہ اقتدار کو طول دینے کا آغاز کیا۔

کنزیومرازم کے نام پر ملٹی نیشنل کمپنیوں نے اپنے بزنس کو لامتناہی طور پر طول دینا شروع

کیا۔ دولت کی تقسیم کا یہ معاملہ ہوا کہ دنیا کی آدھی دولت محض ایک سے دو فی صد امیر ترین لوگوں کے ہاتھ میں مرکوز ہوگئی۔ آج دنیا میں 600 ملین سے زائد لوگ ایسے ہیں جو غربت کی سطح سے نیچے زندگی بسر کررہے ہیں۔ معاشی وسائل محض چند مخصوص گروہوں کے ہاتھ میں یرغمال بن چکے ہیں۔ اس کی بنیاد پر ایک بڑی آبادی کا استحصال ہو رہا ہے۔

سیاست میں بھی یہی عدم مساوات موجود ہے۔ بڑے ممالک اور طاقتیں اپنے اسلحے اور ٹیکنالوجی کے نشے میں بدمست ہوکر جس پر چاہتی ہیں چڑھائی کردیتی ہیں۔ یہ سیاسی چپقلش اس قدر بڑھ چکی ہے کہ مڈل ایسٹ بالخصوص شام عالمی طاقتوں کا اکھاڑا بن چکا ہے اور ظلم وستم کی انتہا ہو رہی ہے۔

اس جدید دور میں مذہب کی کارکردگی بھی مایوس کن رہی مذہب نے اس صدی میں خدا اور بندے اور بندے اور بندے کے تعلق پر فوکس کرنے کے بجائے فرسودہ رسومات ہی کو مذہب بنا کر پیش کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ توکل، تقدیر، نجات، عبادت اور مقصد حیات کی غلط تشریح کر کے لوگوں کو صحیح راہ دکھانے کے بجائے انہیں گمراہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یوں مذہب کا ادارہ عالمی سطح پر اپنی حیثیت کھو بیٹھا اور اس کا اثر چند مخصوص حلقوں تک محدود رہ گیا۔

بعض مذاہب نے دنیا پر قبضہ کرنے کے خواب کو فوکس کر کے دنیا میں فساد برپا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں تو مذہب کے نام پر دو مسلم ریاستوں نے پراکسی وارلڑی اور دنیا کے ایک بڑے خطے کو متاثر کیے رکھا۔ مکافات عمل کے باعث یہ جنگ کی آگ اب ان کے گھروں تک آ پہنچی ہے اور وہ خود اس سے نبٹنے کی تگ ودو کررہے ہیں۔

غریب ملکوں کے اندرونی حالات بھی کچھ تسلی بخش نہیں رہے۔ ان میں چند مخصوص گروہوں نے سیاست اور وسائل پر ناجائز قبضہ برقرار رکھا۔ اس کی عوام ایک جانب مظلوم رہی۔ البتہ عوام کی اکثریت اخلاقی گراوٹ، کاہلی اور سستی کا شکار رہی جس کی بنا پر دوسرے گروہوں کو اس پر تسلط کا موقع مل گیا۔

[جاری ہے]

جاوید چوہدری

مٹی کی مٹھی

ڈاکٹر نے مریض کا بازو سیدھا کیا اور مایوسی سے سر ہلا دیا، بیٹے نے آہستہ آواز میں پوچھا ''کیا کوئی چانس نہیں'' ڈاکٹر نے جواب دیا ''سر! اب نہیں، ہمیں وینٹی لیٹر بند کرنا ہوگا'' بیٹے نے سر نیچے کیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

مریض کی کہانی 1940 میں شروع ہوئی تھی، اس کے والد نے جنوبی کوریا کے شہر ٹائیگو میں چھوٹی سی کمپنی بنائی، کوریائی زبان میں تین ستاروں کو ''سام سنگ'' کہتے ہیں، قدیم روایات کے مطابق اکٹھے طلوع ہونے والے تین ستارے کبھی غروب نہیں ہوتے، والد لی بیونگ چل نے خوش شگونی کے لیے کمپنی کا نام سام سنگ رکھ دیا، یہ لوگ شروع میں فروٹ اور فروزن فش ایکسپورٹ کرتے تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد تعمیر نو شروع ہوئی تو سام سنگ خوراک سے کنسٹرکشن انڈسٹری میں آ گئی اور اس نے دھڑا دھڑ عمارتیں، پل اور سڑکیں بنانا شروع کر دیں، لی بیونگ چل نے ان ٹھیکوں میں کروڑوں روپے کمائے، یہ سمجھ دار انسان تھے، یہ جانتے تھے انسان کو اپنے سارے انڈے ایک ٹوکری میں نہیں رکھنے چاہئیں چناں چہ یہ کنسٹرکشن کے ساتھ ساتھ ٹیکسٹائل، فیشن اور الیکٹرانکس کے کاروبار میں بھی آ گئے، گروپ بڑا ہوتا چلا گیا۔

لی کن ہی، لی بیونگ چل کے تیسرے بیٹے تھے، یہ کند ذہن اور لاابالی مزاج کے لڑکے تھے، پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا لیکن والد انھیں ہر حال میں پڑھانا چاہتے تھے، لی کن ہی نے وسیڈا یونیورسٹی سے اکنامکس کی ڈگری لی اور بزنس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جارج واشنگٹن یونیورسٹی امریکا میں داخلہ لے لیا، جارج واشنگٹن کا دور لی کی زندگی کا فضول اور ناقابل بیان زمانہ تھا، یہ اپنی

ڈگری تک مکمل نہ کر سکے، والد نے انھیں واپس بلایا اور کنسٹرکشن اور ٹریڈنگ کے کام میں لگا دیا، یہ گرتے پڑتے یہ کام کرتے رہے، والد ان کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھے۔

ان کا خیال تھا یہ پوری کمپنی کو ڈبو دیں گے، والد 1987 میں انتقال کر گئے اور لی کو مجبوراً کمپنی سنبھالنا پڑ گئی، کمپنی اس وقت 34 مختلف شعبوں میں کام کر رہی تھی، لی کے لیے اگلے پانچ سال بہت مشکل تھے، یہ ایک دفتر سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کی طرف دوڑتے رہتے تھے یہاں تک کہ 1993 آ گیا، لی کو اچانک محسوس ہوا ہم بہت زیادہ مصنوعات بنا رہے ہیں جس کی وجہ سے ہم کوالٹی میں مار کھا رہے ہیں جب کہ ہمارے حریف صرف ایک ایک کام کرتے ہیں اور ان کی مصنوعات کی کوالٹی سام سنگ سے بہت بہتر ہے۔

لی کو محسوس ہوا ہم نے اگر اپنے حریفوں کو کوالٹی میں مار نہ دی تو ہم پٹ جائیں گے چناں چہ اس نے ایک دن اپنے تمام ایگزیکٹوز کو جمع کیا اور ان سے کہا ہم آج سے اپنی بیوی اور بچوں کے علاوہ سب کچھ بدل رہے ہیں، تم لوگ نقصان کی پرواہ نہ کرو، ہم اگر فٹ پاتھ پر بھی آ جائیں تو بھی کوئی مسئلہ نہیں، آپ بس صرف اور صرف کوالٹی پر توجہ دیں، ہماری پراڈکٹس ہر صورت مارکیٹ میں نمبر ون ہونی چاہئیں، سام سنگ کے لوگو کو گارنٹی ہونا چاہیے۔ یہ میجر شفٹنگ تھی، کمپنی کی انتظامیہ نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ڈٹے رہے، وہ ہر قسم کا نقصان برداشت کرنے کے لیے بھی تیار تھے۔

ایگزیکٹوز نے ہار مان لی اور تعداد کے بجائے معیار پر چلے گئے، شروع کے سال بہت مشکل تھے، کمپنی کے گودام کباڑ خانہ بن گئے، مارکیٹ میں سام سنگ کا انبار لگ گیا، لوگ اس کے سائن بورڈز کے قریب سے بھی نہیں گزرتے تھے، ڈسٹری بیوٹرز تک بھاگ گئے مگر یہ پیچھے نہ ہٹے، 1995 میں ایک طرف کمپنی کا بیڑہ غرق ہو گیا اور دوسری طرف لی کن ہی پر جنوبی کوریا کے صدر

کو 30 ملین ڈالر رشوت دینے کا الزام لگ گیا، یہ تفتیش، انکوائریاں اور عدالتی مقدمات کا سامنا بھی کرنے لگے، وہ دور مشکل تھا مگر اس دور نے انھیں پگھلا کر کندن بنا دیا، یہ نکھرتے چلے گئے۔

سام سنگ اس دوران ٹیلی ویژن کی انڈسٹری میں آ گیا۔ اس کا ٹی وی دیکھتے ہی دیکھتے مارکیٹ لیڈر بن گیا اور چند ماہ میں پیداوار، معیار اور فروخت میں دوسروں کو بہت پیچھے چھوڑ گیا۔ یوں کمپنی 2006 میں اعلیٰ معیار کا گارنٹی کارڈ بن گئی، یہ ہر گھر تک پہنچ گئی، لی کن ہی نے 1998 میں اسمارٹ فونز کا یونٹ بھی لگا لیا، یہ یونٹ گلیکسی کہلاتا تھا، گلیکسی مارکیٹ میں آیا اور اس نے کشتے کے پشتے لگا دیے، یہ بھی دیکھتے ہی دیکھتے عالمی برینڈ بن گیا جس کے بعد سام سنگ 350 بلین ڈالر کی کمپنی بن گئی، لی کن ہی کو فوربس نے 2014 میں دنیا کے 100 بااثر ترین لوگوں کی لسٹ میں بھی شامل کر لیا اور یہ کوریا کا امیر ترین شخص بھی بن گیا، یہ اسٹیٹ سے بھی امیر ہو گیا۔

لی کن ہی کی کامیابی کا پہلا ستون ٹیکنالوجی تھی، سام سنگ کا آر اینڈ ڈی بہت مضبوط ہے، اس نے اہل ترین سافٹ ویئر اور ہارڈ ویئر انجینئرز بھرتی کر رکھے ہیں جن کی وجہ سے یہ گروپ پچھلے دس برسوں سے مارکیٹ کو لیڈ کر رہا ہے، دوسرا یہ گروپ معیار پر کمپرومائز نہیں کرتا، آپ ان کی کوئی پراڈکٹ اٹھا کر دیکھ لیں، پیکنگ سے لے کر سائز تک آپ کو اس کا معیار حیران کر دے گا اور تیسرا لی کن ہی خرید و فروخت کا ایکسپرٹ تھا، یہ راستے کی ہر رکاوٹ کو خرید کر یا گرا کر آگے نکل جاتا تھا۔

یہ جنوبی کوریا کے قوانین تک بدل دیتا تھا، یہ اپنی مرضی کی حکومتیں بھی لے آتا تھا اور اعلیٰ عدالتوں کے جج بھی بدل دیتا تھا چناں چہ یہ اسٹیٹ کے اندر ایک اسٹیٹ بن گیا اور یہ اسٹیٹ اصل اسٹیٹ سے بڑی اور مضبوط تھی، آپ جنوبی کوریا کی تاریخ نکال کر دیکھ لیں، آپ کو ملک کے ہر سیاسی اتار چڑھاؤ کے پیچھے سام سنگ اور لی کن ہی ملے گا، یہ درجنوں مرتبہ انکوائریوں، تفتیشوں اور مقدمات کا ہدف بنا، اس پر صدور کو رشوت دینے کے الزام بھی لگے اور اسے سیاسی

خرید وفروخت کا بیوپاری بھی کہا گیا۔

2008 میں اس پر ٹیکس چوری کے الزامات ثابت ہو گئے، اسے سزا بھی ہوئی لیکن اس نے عدالت اور حکومت دونوں کو خرید لیا، سزا معاف ہوگئی تاہم اسے انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کا عہدہ واپس کرنا پڑ گیا، یہ پورے کوریا میں بدنام تھا مگر اسے کوئی ندامت، کوئی پریشانی نہیں تھی، یہ میدان میں ڈٹا رہتا تھا، یہ خود اپنے منہ سے کہتا تھا آپ اگر دولت سے آسانیاں نہیں خرید سکتے تو پھر آپ کو دولت مند ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ چناں چہ یہ سامنے موجود ہر شخص کو چند لمحوں میں خرید لیا کرتا تھا، اس کی یہ عادت اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ اس نے آخر میں زندگی کو بھی خریدنے کی کوشش شروع کر دی۔

چیئر مین لی کن ہی کو 2014 میں ہارٹ اٹیک ہوا اور یہ کوما میں چلا گیا، اس کی وصیت کے مطابق اسے وینٹی لیٹر پر شفٹ کر دیا گیا اور اس کے لیے نئی ادویات کی ایجاد کا کام شروع کر دیا گیا، سام سنگ نے درجنوں ریسرچ اداروں کو فنڈ نگ کی، بڑے سے بڑے ڈاکٹر کا بندوبست کیا اور قیمتی سے قیمتی ترین ادویات بنوائی گئیں مگر لی کن ہی کومے سے باہر نہ آ سکا، اس کے بیٹے لی جائے یونگ نے کمپنی کی عنان سنبھال لی، یہ اپنے والد کو ایک بار اپنے پاؤں پر کھڑا دیکھنا چاہتا تھا، اس کی شدید خواہش تھی یہ ایک بار اپنے منہ سے بولیں۔

یہ اپنے ہاتھ سے کھائیں اور ایک بار! جی ہاں ایک بار اپنی کھلی آنکھوں سے سام سنگ کی نئی اسکرین دیکھیں لیکن لی جائے یونگ کی کوئی کوشش بار آور نہ ہو سکی اور یوں 25 اکتوبر 2020 کی وہ شام آ گئی جب ڈاکٹروں نے مایوسی کا اعلان کر دیا، لی کن ہی کومے کے عالم میں انتقال کر گیا اور اس کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا، ڈاکٹر نے اس کا بازو سائیڈ پر رکھا اور مایوسی میں سر ہلا دیا، سام سنگ کا مالک مر چکا تھا لیکن مرنے کے باوجود اس کے اکاؤنٹ میں 20 بلین ڈالرز تھے اور یہ

350 بلین ڈالرز کی کمپنی کا مالک تھا مگر 350 بلین ڈالرز کی کمپنی اور 20 بلین ڈالرز کے اکاؤنٹس موت کا مقابلہ نہ کر سکے، مسافر چھ سال کی طویل نیند کے بعد اگلے سفر پر روانہ ہو گیا۔

لی کن ہی کی موت نے ایک بار پھر ثابت کر دیا انسان دنیا میں دولت کے ذریعے سب کچھ خرید سکتا ہے لیکن یہ کتنا ہی بڑا بیوپاری کیوں نہ ہو جائے یہ ایک بھی اضافی سانس نہیں خرید سکتا اور اس کے پاس قدرت کے سامنے ہارنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا، کہتے ہیں انسان اگر زندگی خرید سکتا تو ہم آج بھی نمرود اور فرعون کی خدائی میں سانس لے رہے ہوتے، موت وہ امر ربی ہے جس کے ذریعے اللہ لی کن ہی جیسے لوگوں کو یہ پیغام دیتا ہے، جاؤ تم جتنا بھاگ سکتے ہو بھاگ لو لیکن تم نے آخر میں میرے پاس ہی آنا ہے، میں تمہیں کائنات کے کسی کونے میں چھپنے نہیں دوں گا اور یہ چھپنے دیتا بھی نہیں، تاریخ انسانی خداؤں کا قبرستان ہے، آپ کسی دن تاریخ کے قبرستان میں جھانک کر دیکھیں۔

آپ کو ہر قبر میں کوئی نہ کوئی ایسا شخص لیٹا ملے گا جو خود کو ناگزیر بھی سمجھتا تھا اور ناقابل شکست بھی لیکن پھر کیا ہوا؟ سن کنگ سے لے کر مون کوئین تک دنیا کے ہر ناگزیر کے لیے مٹی آخری لحاف ثابت ہوئی، اللہ کی اس دنیا میں لی کن ہی جیسا شخص بھی چھ چھ سال اسپتال میں بستر پر لیٹ کر آنکھ نہیں کھول پاتا اور اس سے امیر تیمور اور ہٹلر جیسا شخص بھی خالی ہاتھ واپس جاتا ہے لیکن ہم اس قبرستان میں پوری زندگی ''میں میں'' کی آوازیں لگاتے رہتے ہیں اور ہمیں شرم بھی نہیں آتی، بھائی میرے! اپنی اوقات دیکھ کر بولو، تم کورونا کا مقابلہ تو کر نہیں سکتے، زندگی اور موت دینے والے کا کیا خاک مقابلہ کرو گے، مٹی کی مٹھی ہو، مٹی بن کر رہو، خدا نہ بنو کیوں کہ خدا اپنے سوا کسی کو خدا نہیں رہنے دیتا۔

[بشکریہ: ایکسپریس نیوز]

پروین سلطانہ حنا

پیاری امی کی یاد میں

(ابو یحییٰ صاحب کی ہمشیرہ، پروین سلطانہ حناؔ کی اپنی والدہ کی وفات پر لکھی گئی ایک تحریر جو مستقبل کی ماؤں کے لیے اولاد کی تربیت کے سلسلے میں رہنمائی عطا کرے گی۔)

آج 18 نومبر 2020 ہے۔ ویسے تو امی کی طبیعت ایک ماہ سے کافی خراب تھی، مگر آج صبح سے امی کی سانسیں متغیر ہو رہی ہیں۔ میں عشاء کی نماز پڑھ کر امی کے پاس بیٹھ گئی ہوں اور سورہ یسین کی تلاوت کر رہی ہوں۔ امی کے ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ میں کوشش کر رہی ہوں کہ اپنے ہاتھوں کی حرارت امی کے ہاتھوں میں منتقل کر دوں بالکل ایسے ہی جیسے وہ بچپن میں میرے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی ٹھنڈک کو اپنے ہاتھوں کی گرمی سے کم کیا کرتی تھیں۔

امی میں آپ کو آوازیں دے رہی ہوں، مگر آپ بے خبر ہیں اور میری آواز نہیں سن رہی ہیں۔ میں لا الہ الا اللہ کا ورد کر رہی ہوں مگر آپ کے چہرے کی زردی بتا رہی ہے کہ زندگی شاید زیادہ دیر تک آپ کا ساتھ نہ دے سکے۔ میں سورہ واقعہ کی اس آیت کی تلاوت کرنے لگی ہوں۔

فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ۔ وَأَنتُمْ حِينَئِذٍ تَنظُرُونَ ۔وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنكُمْ وَلَكِن لَّا تُبْصِرُونَ۔

اور جب روح حلق میں آ پہنچتی ہے اور تم اس وقت کی حالت کو دیکھ رہے ہوتے ہو اور ہم اس مرنے والے سے تم سے بھی زیادہ قریب ہوتے ہیں، مگر تم کو نظر نہیں آتے۔

میری امی کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی ہے اور وہ خالق حقیقی سے جا ملی ہیں۔

يَـا أَيَّتُهَـا الـنَّـفْـسُ الْـمُطْمَئِنَّةُ ـ ارْجِعِيْ إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ـ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ ـ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ـ

اے اطمینان پانے والی روح اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ تو میرے ممتاز بندوں میں داخل ہو جا اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔

خدا نے مجھے یہ اعزاز دیا کہ میری زندگی کی پہلی سانس سے اپنی امی کی زندگی کی آخری سانس تک، ان کا اور میرا ساتھ رہا ہے۔ امی آپ مجھ سے جدا ہو گئی ہیں، مگر آپ کی یادوں اور باتوں کے نقش اتنے گہرے ہیں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گی۔ آپ کی زندگی کی ایک ایک ادا اللہ کی محبت کا مظہر تھی۔ شدید دکھ، تکلیف اور بیماری میں جب بھی کوئی آپ کی طبیعت کا پوچھتا تو آپ اس کے جواب میں الحمدللہ کہتیں۔

ہم نے آپ کو کبھی کسی سے شکوہ کرتے یا کسی سے اونچی آواز سے بات کرتے نہیں دیکھا۔ خفگی میں بھی آپ کا لہجہ کومل کی طرح نرم رہتا۔ آپ کہتی تھیں کہ بچے اللہ کی امانت ہیں۔ انھیں پیار سے پالنے کا ثواب عبادت کے برابر ہے۔ آپ نے کبھی کسی بچے پر نہ غصہ کیا نہ مارا۔ اوروں کو تلقین کرتیں کہ اپنے بچوں کو مار کر نہ پالو، انھیں آرام سے سمجھاؤ، ان کی تکلیف کو دور کرو۔ مجھے یاد ہے کہ روتے ہوئے بچے کو چپ کرانے کے لیے وہ اپنا کام روک دیتی تھیں اور جب اس کی تکلیف کو دور کر دیتیں تو پھر اپنا کام پورا کرتی تھیں۔

اکثر لوگ ہمیں بسم اللہ کے بچے کہا کرتے تھے کیونکہ ہر موقع پر بسم اللہ پڑھتیں۔ اور جب کبھی کوئی بچہ گر جاتا تو اسے گود میں اٹھاتے ہوئے بسم اللہ کہتی تھیں۔ امی نے ہمیشہ باوضو ہو کر ہمیں دودھ پلایا۔ بچے کا گدا اپنے پاس رکھ کر نماز پڑھتیں تاکہ بچے کی گھٹی میں نماز کی عادت پڑ جائے۔ جب بچہ بولنا شروع کرتا تو حضرت موسیٰ کی دعا رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ـ وَيَسِّرْ

لِیُ أَمْرِیُ۔ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّن لِّسَانِیُ۔ یَفْقَھُوا قَوْلِیُ، یاد کراتیں اور سب کو تلقین کرتیں کہ جب بچہ بولنا شروع کرے تو اسی دعا سے اسے بولنا سکھاؤ۔ میں اور میرے بیشتر بہن بھائیوں نے تعلیم کے میدان میں اعلیٰ ترین پوزیشن لی، گولڈ میڈل حاصل کیے۔ وہ سب کو بتاتیں کہ دیکھو میرے بچے اسی دعا کی برکت سے اس مقام پر پہنچے ہیں۔

ہم جب ان کا ہاتھ پکڑ کر زینے سے اترتے تو سبحان اللہ اور زینہ چڑھتے ہوئے اللہ اکبر پڑھاتیں۔ ہم صبح سو کر اٹھتے تو بچوں سے کہتیں کہ طوطے کے پنجرے کے پاس جا کر ان کو کلمہ پڑھا کر ان کی صبح کا آغاز کرو۔ یوں ہم کو خود بھی صبح کلمہ پڑھ کر اپنا دن شروع کرنے کی عادت ڈال دی۔ غرض ان کی ہر بات اور ہر عمل میں اللہ کا ذکر ہوتا۔ درود شریف کثرت سے پڑھا کرتی تھیں اور جمعہ کے روز درود کی کثرت اور سورہ کہف کی تلاوت کی پابندی کراتی تھیں۔

بلاشبہ ماں اپنے بچوں کے لیے ایک رول ماڈل ہوتی ہے۔ پیاری امی اکثر قرآن، حدیث، اسلامی تعلیمات، صحت وطب اور تعمیر زندگی کے حوالے سے مختلف کتب کا مطالعہ کیا کرتی تھیں۔ ہم میں سے اکثر بہن بھائیوں کو مطالعے کا شوق انھی کو دیکھ کر ہوا۔

میں یہ سب باتیں اس لیے لکھ رہی ہوں کہ میرا یہ مضمون آج کل کی ماؤں کے لیے بچوں کی تربیت کے پہلو سے ایک گائیڈ لائن بن جائے۔ ایک نامور مفکر کا قول ہے کہ تم مجھے بہترین مائیں دو، میں تمھیں بہترین نسل دوں گا۔ اللہ پاک میری بہنوں کو آنے والی نسلوں کی تربیت کے لیے ان جیسی صفات کا حامل بنائے۔ نیک اولاد صدقہ جاریہ ہوتی ہے۔ جو لوگ اللہ سے سچی محبت کرتے ہیں، اللہ اپنے بندوں کی خدمت کے لیے ان کی نسلوں کو قبول کرتا ہے۔ جیسا کہ پیاری امی کے بیٹوں میں ابو یحییٰ اور قاری سلیم رفیق اور پوتوں میں عالم اسلام کے نامور قاری سعد القرشی اور حافظ حسن سلیم شامل ہیں۔ میں اکثر امی سے کہا کرتی تھی کہ آپ کو کچھ ہو گیا تو میں اکیلی

رہ جاؤں گی۔امی مجھے سمجھاتیں کہ بیٹے اگر میں نہ رہوں تو تم گھبرانا نہیں کہ اس لیے کہ ہم کبھی اکیلے نہیں ہوتے،اللہ ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ میری امی جیسا صبر، ہمت اور حوصلہ مجھے بھی عطا فرمائے۔آپ نے آخری بیس برسوں میں منہ اور گھٹنوں کی شدید تکلیف اور آخری دنوں میں بیماری کی شدید اذیت جھیلی،مگر آپ نے کبھی خدا سے کسی تکلیف کی کوئی شکایت نہیں کی نہ دوسروں کے سامنے اس کا اظہار کیا نہ ان کو کسی قسم کی کوئی تکلیف دی۔

امی میں آپ کے عزم، ہمت اور حوصلے کو سلام کرتی ہوں اور اللہ سے حسن ظن رکھتی ہوں کہ وہ آپ کو بہشتِ بریں کی شاندار نعمتوں میں آرام وسکون سے شادرکھے گا۔آپ کا پرسکون چہرہ مجھے حرف تسلی دے کر کہہ رہا ہے:

میں اسی رب کی نعمتوں میں ہوں

ماں سے ستر گنا جو چاہتا ہے

صبر کو وہ بہت سراہتا ہے

اس لیے تم اداس مت ہونا

اب میرے ہجر میں نہیں رونا

یہ جدائی بہت ہی تھوڑی ہے

ہاں بہت جلد ہم بہم ہوں گے

پھر کبھی بھی جدا نہ ہم ہوں گے

ڈاکٹر عامر گزدر

اسلامی شریعت میں رفع حرج اور آسانی (7)

فقہائے کرام کے نزدیک جمعہ و جماعت سے رخصت

مذکورہ بالا روایتوں کی روشنی میں ہمارے فقہا نے بھی اپنی مولفات میں جمعے اور جماعت کو ترک کرنے کے اعذار تفصیل سے بیان کیے ہیں، جن کو ہم ذیل میں پیش کریں گے:

ترک جمعہ و جماعت کے انفرادی اعذار

۱۔ ایسی بیماری جس میں ایک شخص کے لیے مسجد کی حاضری باعث مشقت ہو۔

۲۔ جان، مال، آبرو یا اہل وعیال کے حوالے سے آدمی کو کوئی خوف اور خطرہ لاحق ہو یا وہ گھر پر کسی مریض کی تیمار داری اور نگہداشت پر مامور ہو۔ (اِس میں، ظاہر ہے کہ طبیب، سرجن، ہسپتالوں میں ایمرجنسی وارڈ میں کام کرنے والا عملہ، لوگوں کے جان و مال کے تحفظ پر مامور آفیسرز، محافظ، پولیس اور فوجی بھی شامل سمجھے جائیں گے)۔

۳۔ بھوک کی حالت میں کھانا حاضر ہو۔

۴۔ رفع حاجت کا تقاضا ہو۔

۵۔ پیاز، لہسن یا اِسی طرح کی کوئی چیز آدمی نے کھائی ہو جس کی بو سے دوسرے نمازیوں کو اذیت پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایسے شخص کے لیے مسجد کی حاضری سے رخصت نہیں ہے، بلکہ اِس کے لیے مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فقہا نے مکروہ قرار دیا ہے۔ یہی حکم، ظاہر ہے کہ ایسے پیشوں میں کام کرنے والے تمام لوگوں کا ہو گا جن کے پیشے کی وجہ سے اُن کے وجود سے لوگوں کو بو محسوس ہوتی اور اذیت پہنچتی ہو اور اِسی طرح برص اور جذام کے مریض، جن کی موجودگی سے لوگ اذیت میں مبتلا ہوتے ہیں، اُن کو بھی بعض فقہا نے اِسی کے تحت رکھا ہے۔

۶۔ بدن کو ٹھیک سے ڈھانپنے کے لیے آدمی کے پاس کپڑے نہ ہوں۔

۷۔ سفر کی تیاری اور روانگی کا موقع ہو اور باجماعت نماز کے لیے آدمی مسجد چلا جائے تو سفر میں کسی دشواری یا قافلے کے چھوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔

۸۔ سخت نیند کا غلبہ ہو۔

۹۔ علمائے حنفیہ کے نزدیک نابینا شخص بھی جماعت کی حاضری سے معذور سمجھا جاتا ہے۔

۱۰۔ آدمی شادی کر کے بیوی کو گھر لایا ہو اور جماعت کا وقت ہو جائے تو فقہائے شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک ایسے شخص کو بھی جماعت کی حاضری سے رخصت حاصل ہو گی۔ شافعیہ نے البتہ، اِس رخصت کو رات کی نمازوں کے ساتھ مقید مانا ہے۔

۱۱۔ علمائے شافعیہ نے زیادہ موٹاپے کو بھی ترک جماعت کے لیے باعث رخصت مانا ہے۔

۱۲۔ علمائے حنفیہ نے علم فقہ میں اشتغال کو بھی جماعت ترک کرنے کے لیے معتبر عذر مانا ہے۔

ترک جمعہ و جماعت کے عمومی اور اجتماعی اعذار

۱۔ تیز بارش جس میں لوگوں کے لیے مسجد کی حاضری میں دشواری ہو۔

۲۔ آندھی جس کی وجہ سے گھر سے نکلنا ممکن نہ ہو۔

۳۔ سخت سردی یا گرمی جس میں مسجد جانا باعث مشقت ہو۔

۴۔ شدید کیچڑ جو لوگوں کے لیے باعث اذیت ہو۔

۵۔ انتہائی تاریکی جس کی وجہ سے آدمی کے لیے مسجد جانا دشوار ہو یا جان کا خطرہ محسوس ہو۔ (دیکھیے: الموسوعة الفقهية الكويتية، وزارة الاوقاف والشئون الاسلامية الكويت، ج27، ص 191-186)

اِن عمومی اعذار کے حکم میں، ظاہر ہے کہ ہر وہ حالت شامل سمجھی جائے گی جو لوگوں کو مسجد کی

حاضری سے روکنے کا باعث بن جائے، جیسے زلزلہ، آگ لگ جانا، باہر کسی دشمن کا موجود ہونا یا بیماری وغیرہ کی صورت میں کسی وبا کا پھیل جانا ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے واضح ہے کہ فرض نمازوں کو جماعت کے ساتھ اور مسجد میں ادا کرنا معمول کے حالات میں ایک باعث اجرعمل اور فضیلت کی چیز ہے اور اِس حکم میں عورتیں اصلاً شامل نہیں ہیں۔ نماز کی صحت کے لیے اِس کی حیثیت کسی لازمی شرط کی قطعاً نہیں ہے۔ پھر اسلامی شریعت کے احکام میں، جیسا کہ پیچھے تفصیل سے بیان ہو چکا ہے، نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے لیے کوئی تنگی اور مشقت نہیں رکھی گئی ہے، بلکہ عذر اور زحمت کی بنا پر واجباتِ دین اور شرائط عبادات میں بھی رخصتیں اور رعایتیں دی گئی ہیں۔ چنانچہ عذر کی بنا پر رفع حرج اور آسانی دینے کے قرآنی اصول پر باجماعت نماز کے اِس پسندیدہ عمل میں بھی، ظاہر ہے کہ مردوں کو رخصت حاصل ہوگی، جیسا کہ زحمت اور دشواری کے مواقع پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے اِس سے لوگوں کو رخصت دی تھی اور ہمارے فقہا نے بھی اِس کو بہت وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

[جاری ہے]

پروین سلطانہ حناؔ

نصیحت

یہ آنکھیں غور سے دیکھو
نہ جانے کب یہ بجھ جائیں
یہ چہرہ غور سے پڑھ لو
نہ جانے کب نظر کی دسترس سے دور ہو جائے
صدا یہ غور سے سن لو
نہ جانے کب سماعت کی حدوں کو پار کر جائے
اگرچہ کام ہوں تم کو، بہت آلام ہوں تم کو
بہانہ مت ، ستانہ مت، انھیں دل سے بھلانا مت
تھکن سے چور ہے کتنا، مگر پُر نور ہے کتنا!
یہ چہرہ ماں کا چہرا ہے
یہ آنکھیں ماں کی آنکھیں ہیں
جو تیرے غم میں جاگی ہیں
دعا جوان کی لگ جائے، تو بیڑا پار ہو جائے
سو جو بھی وقت باقی ہے
غنیمت جان لو اس کو
متاعِ زندگی کی قیمتی شے مان لو اس کو

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

فون: 0332-3051201 , 0312-2099389
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

ماہنامہ انذار

ایک دعوتی واصلاحی رسالہ ہے۔اس کا مقصد لوگوں میں ایمان واخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھوایئے۔اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کیلئے:

فی کاپی سالانہ سبسکرپشن چارجز: (بذریعہ رجسٹری) صرف 900 روپے

ایجنسی ڈسکاؤنٹ 20 فیصد ہے۔ ایجنسی ڈسکاؤنٹ کے لیے کم از کم ہر ماہ پانچ رسالے لینا ضروی ہے۔

سبسکرپشن چارجز مندرجہ ذیل پر ارسال کریں	
Easy Paisa	Muhammad Shafiq 0334-3799503 CNIC # 42201-8355292-9
Money Order	Monthly Inzaar 4th Floor Snowhite Centre Abdullah Haroon Road Opp. Hotel Jabees Saddar Karachi
Account	Title of Account: Monthly Inzaar A/C # 0171-1003-729378 Bank Al Falah Saddar Branch Karachi.

آپ سے درخواست ہے کہ سبسکرپشن چارجز بھیجنے کے بعد اپنے نام اور موبائل نمبر کے ساتھ نیچے دیے ہوئے نمبر پر کال یا SMS ضرور کریں تا کہ آپ کے رسالے کی سبسکرپشن کی جا سکے۔مزید معلومات کے لیے ان نمبرز پر رابطہ کریں۔شکریہ

0332-3051201 , 0312-2099389

اگر آپ ہماری دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ:

1) ہمارے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے

2) 'ماہنامہ انذار' کو پڑھیے اور دوسروں کو پڑھوایئے

3) تعمیرِ ملت کے اس کام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے رسالے کی ایجنسی لیجیے

Monthly
INZAAR
JAN 2021
Vol. 09, No. 01
Regd. No. MC-1380
Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,
25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi